گوپی چند نارنگ
اور اُردو تنقید
میر ظہیر عباس روستمانی
ڈاکٹر سیفی سرونجی

گوپی چند نارنگ اور اُردو تنقید

سیفی سرونجی

GOPI CHAND NARANG AUR URDU TANQEED

BY

SAIFI SIRONJI

نام کتاب : گوپی چند نارنگ اور اردو تنقید

مصنف : سیفی سرونجی

سن اشاعت : ۲۰۰۶ء

قیمت : ۱۵۰ روپے

کمپوزنگ و

طباعت : فاس کمپیوٹرانکس، ۷ ۳، چوکی تلیا، بھوپال-۴۶۲۰۰۱

ناشر : انتساب پبلی کیشنز، سیفی لائبریری، سرونج (ایم. پی.)

ملنے کے پتے :

- سدبھاؤنا منچ پبلی کیشنز، سرونج (ایم. پی.)
- سہ ماہی کاروانِ ادب، زیب وِلا، گنوری، بھوپال
- مرکز ادب، ایم.ایل. بی. کالج روڈ، بھوپال
- سہ ماہی چہارسو، راولپنڈی، پاکستان
- استعارہ پبلی کیشن، دہلی

SAD BHAWNA PUBLICATION

SIRONJ, M.P.- 464228

ترتیب مضامین

دیباچہ

محمد ایوب واقفؔ

جناب سیفی سرونجی ہمہ داں اور ہمہ صفت شخصیت کے مالک ہیں۔ وہ شاعر بھی ہیں اور نقاد بھی، انھوں نے افسانے بھی لکھے ہیں اور سفرنامے بھی، لیکن میری نظر میں ان کی سب سے بڑی مستند اور مشہور حیثیت ایک الوالعزم مدیر کی رہی ہے۔ جی ہاں! وہ اردو کے ایک مشہور و معروف اور صحت بخش جریدے سہ ماہی انتساب کے مدیر اعلیٰ ہیں۔ اگرچہ انھوں نے مالوہ کے ایک چھوٹے سے مقام سرونج سے تقریباً بیس سال قبل اس جریدے کی شروعات کی تھی لیکن آج اس جریدے نے برصغیر ہند و پاک کی سرحدیں عبور کر کے برطانیہ، امریکہ، جرمنی اور خلیج کے ممالک میں اپنی مقبولیت اور شہرت کے پرچم لہرا دیے ہیں۔ سیفی سرونجی اگرچہ ایک قلندرانہ مزاج کے حامل اور بوریا نشین انسان ہیں لیکن خدا نے انہیں شعر و ادب کی تاجوری عطا کی ہے، وہ شائقینِ علم و ادب کی ہر طرح کی تعریف و توصیف کے مستحق ہیں۔ ہم ان کے حق میں خدائے برتر و بالا سے دعا کرتے ہیں کہ وہ انہیں ایک طویل عمر دے تاکہ وہ علم و ادب کی خدمت اسی شوق و ولولہ کے ساتھ انجام دیتے رہیں کیونکہ اللہ کی اس دنیا میں اس سے بڑی اور کوئی خدمت نہیں ہوتی۔

سیفی سرونجی صاحب نے ویسے تو اردو ادب کی بہت سی شخصیتوں کو اپنی تحریر کا موضوع بنایا ہے لیکن اصلاً وہ گوپی چند نارنگ کی باغ و بہار اور ہمہ گیر شخصیت کے کچھ زیادہ ہی قائل ہیں، ہماری نظر میں اس پسند کی کچھ بالکل جائز و فائق وجوہات ہیں۔ گوپی چند نارنگ صاحب اپنی دنیاوی زندگی میں ہی لیجنڈ (Legend) بن چکے ہیں، ان کی

ادبی ولسانی خدمات بے پناہ ہیں، مابعد جدیدیت کی تحریک کے تو وہ اہم ترین قائد ہیں، ہندوستان اور پاکستان سے لے کر برطانیہ اور امریکہ تک ان کی گونا گوں نگارشات کی خوشبو پھیلی ہوئی ہے۔ سیفی سرونجی صاحب گوپی چند نارنگ کی عظیم الشان شخصیت کے ان پہلوؤں کے قائل رہے ہیں، ایک عرصے سے وہ اس ادھیڑ بن میں تھے کہ وہ اپنے اس پسندیدہ اور چہیتے فنکار پر کوئی کتاب لکھیں۔ خدا کا شکر ہے کہ وہ اپنے اس مشن میں کامیاب و کامران ثابت ہوئے۔ گوپی چند نارنگ پر ان کی کتاب تیار ہے، ہمیں امید ہے کہ ان کی یہ کتاب عنقریب زیورِ طباعت سے آراستہ ہوکر منظر عام پر آجائے گی۔

گوپی چند نارنگ پر ویسے تو کئی کتابیں اور رسائل کے کچھ خاص نمبر شائع ہو چکے ہیں لیکن مذکورہ کتابوں اور نمبروں کی حیثیت حتمی نہیں ہے، ابھی ان کی مختلف النوع شخصیت کے بہت سے گوشے اور پہلو ایسے بھی ہیں جن پر لکھا جانا ضروری ہے۔ مجھے یقین ہے کہ سیفی صاحب کی زیر نظر کتاب ان نئے گوشوں اور پہلوؤں کو اجاگر کرنے میں خصوصی کردار ادا کرے گی۔ میں اس کتاب کی تیاری اور اشاعت پر انہیں صدق دل سے مبارکباد دیتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ ایسی گرانقدر کتابیں وہ اردو کی دوسری شخصیتوں پر بھی قلم بند کریں گے۔ مجھ سے سیفی صاحب نے فرمائش کی تھی کہ ان کی اس کتاب پر ایک مختصر سا دیباچہ تحریر کردوں چنانچہ جلد بازی میں یہ چند سطریں لکھدی ہیں۔ خدا کرے کہ میری یہ مختصر سی تحریر ناظرین کو گراں نہ گزرے۔

منگل آشیش، 'بی' سیکٹر نمبر ۱۲،
کوپر کھیرانے، نئی ممبئی 400 709

☆☆☆☆

اردو کا رسم الخط ثقافتی اور تاریخی اہمیت کا حامل جسے تبدیل کرنا زبان کی شخصیت کو قتل کرنا ہے

گوپی چند نارنگ

مرکزی ساہتیہ اکادمی کے صدر پروفیسر گوپی چند نارنگ کا کہنا ہے کہ اردو کا رسم الخط بڑی ثقافتی اور تاریخی اہمیت کا حامل ہے جسے تبدیل کرنا زبان کی شخصیت کو قتل کرنے کے مترادف ہے۔ یہ بات ان کی تازہ علمی کتاب ''اردو زبان اور لسانیات'' میں کہی گئی ہے جسے رام پور کی رضا لائبریری کے زیر اہتمام شائع کیا گیا ہے۔ یہ پچیس انتہائی اہم علمی و تحقیقی مضامین پر مشتمل ہے جو ہندوستان کی صدیوں کی ملی جلی تہذیب اور ثقافت کی آئینہ دار اردو زبان کے تاریخی ارتقاء اور پس منظر کو بڑی علمی و تکنیکی مہارت سے پیش کرتے ہیں۔

پروفیسر گوپی چند نارنگ بین الاقوامی سطح کے مشہور دانشور، ادیب، نقاد اور ماہر لسانیات ہیں۔ نارنگ نے اپنی پوری زندگی اردو ادب، تاریخ، ثقافت اور لسانیات کی خدمت میں صرف کی ہے۔ ان کے خیال سے سبھی متفق ہوں گے کہ اردو زبان ہندوؤں اور مسلمانوں کے اشتراک کی نشانی ہے اور ہندوستان کی ایک ہزار سالہ گنگا جمنی تہذیب کی امین ہے۔ نارنگ کے خیال میں اردو کا رسم الخط بھی بڑی ثقافتی اور تاریخی اہمیت کا حامل ہے جسے تبدیل کرنا زبان کی شخصیت کو قتل کرنے کے مترادف ہے۔ اس اہم کتاب میں ایسے مضامین منتخب کئے گئے ہیں جن سے اردو زبان کی تاریخ، خصوصیات اور رسم الخط کے مختلف پہلوؤں پر گہری روشنی پڑتی ہے اور اردو کی ہیئت، اس کی صوتیات، اسلوبیات اور بہت سارے تکنیکی مسائل کو بڑے ہی دلکش طور پر پیش کیا گیا ہے۔

گوپی چند نارنگ اور اردو تنقید

آب حیات سے لیکر حالی کی مقدمہ شعر و شاعری تک اور حالی سے لیکر آج تک اردو تنقید پر اتنا کچھ لکھا گیا ہے کہ اتنا ادب تخلیق نہیں کیا گیا جتنا کہ تنقید لکھی گئی اور ہر نقاد نے اپنے اپنے طور پر ادب میں اپنے خیالات نظریات سے اضافہ کیا ہے آج اگر ہم اردو تنقید کے تمام تر سرمائے پر ایک نظر ڈالتے ہیں تو ایسا لگتا ہے کہ ہمارا ادب دنیا کے کسی بھی ادب سے کم نہیں ہے بلکہ یہ ایک سنگین مسئلہ ہے کہ اس کا قاری نہیں ہے تنقید کی ابتدا یوں تو ہمارے ادب میں تذکروں کے ذریعہ پہلے ہی ہو چکی تھی لیکن اردو تنقید کی با قاعدہ کتاب خواجہ الطاف حسین حالی کی کتاب مقدمہ شعر و شاعری سے ہی ہوتی ہے اور اس کتاب کو اردو کی پہلی با قاعدہ تنقیدی کتاب تسلیم کیا گیا ہے خواہ اس کا معیار کچھ بھی رہا ہو چاہے شبلی نعمانی کی شعر العجم زیادہ اہمیت رکھتی ہو لیکن تنقید کا نام آتے ہی سب سے پہلا نام حالی کا ہی آتا ہے حالانکہ ان دونوں کتابوں سے پہلے آب حیات لکھی جا چکی تھی، گلشن بے خار کا نام بھی لیا جا سکتا ہے ظاہر ہے کہ کہیں نہ کہیں مصلحت اور معیار کا تعین اپنے اپنے نظریات اور سوچ کے مطابق کیا جاتا تھا، ابھی تک دنیا میں ایسی کوئی کتاب نہیں لکھی گئی ہے جسے حرف آخر کہا جائے یا جس میں ادب اور اس کے معیار کا صحیح تعین کیا گیا ہو سب نے اپنے اپنے خیالات اور اپنے اپنے علم کی روشنی میں تنقیدی اصلاحات وضع کرتے ہوئے کچھ نہ کچھ ادب کو دیا ہے اور تنقید کا یہ سلسلہ منزل بہ منزل آگے بڑھتا رہا ہے تنقید کے مسلسل ارتقاء کے بارے میں پروفیسر گوپی چند نارنگ کی ایک کتاب کے دیباچے سے یہ اقتباس دیکھئے:

”History of Literary Critics کیمبرج کی ساتویں اور تازہ ترین جلد میں 1950 سے 2000 تک کی مدت کو

Age of Critisisim کہا گیا ہے یعنی اس نصف صدی میں
عالمی سطح پر سب سے زیادہ ترقی تنقید نے کی اور جن ادبی مباحث
نے سب کو متاثر کیا وہ تنقید اور تھیوری سے متعلق ہیں اردو میں بھی
ادھر کا کچھ زمانہ ادبی تھیوری کے زور دار مباحث اور نئی تبدیلیوں کا
ہے جن میں کسی نہ کسی حد تک میں برابر شریک رہا ہوں۔''

پروفیسر گوپی چند نارنگ کے اس اقتباس سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ پچھلے پچاس برسوں میں تنقید پر سب سے زیادہ لکھا گیا ہے یعنی حالؔی سے لیکر آج تک اردو ادب میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ شاعری کے علاوہ افسانہ، ناول، ڈرامہ، داستان، سفرناموں اور دیگر اصناف کے مقابلے میں تنقید سب پر حاوی رہی یوں تو اردو تنقید کے خد و خال ہمارے تذکروں میں بہت واضح اور صاف طور پر دیکھے جاسکتے ہیں لیکن تنقید کے اصول بہت بعد میں وضع کئے گئے محمد حسین آزاد کی آب حیات ہو یا نواب شیفتہ کی گلشن بے خار ہو ان تذکروں میں اپنے اپنے حلقے کے شاعروں کو زیادہ جگہ دی گئی ہے یعنی اقرباء پروری کا سلسلہ کوئی نیا نہیں ہے۔ اردو ادب یا تاریخ ہو فلسفہ ہو یا کوئی تصنیف و تالیف کا سلسلہ ہو کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی طور پر اقرباء پروری یا ذاتی تعلقات ہر جگہ ہر تصنیف میں ملیں گے پھر تنقید کیسے بچ سکتی ہے ظاہر ہے چراغ سے چراغ جلتا ہے اور یہ ہمیشہ ہوتا رہا ہے اور ہوتا رہے گا اس طرح تنقید منزل بہ منزل ترقی کرتی رہی رفتہ رفتہ تنقیدی اصول اور نظریات پر لکھا جاتا رہا اور چند ہی برسوں میں ہماری تنقید اتنی مکمل اور صاف دکھائی دینے لگی کہ اس کے اصولوں کے ساتھ ساتھ نئی نئی بحثیں نئے نئے نظریات واضح کئے جانے لگے حالؔی کی مقدمہ شعر و شاعری نے جتنا اثر قائم کیا وہ اردو تنقید کی اور کتاب نے نہیں کیا لیکن حالؔی کی یہ کتاب تنقید کی ابتدائی کتاب تھی اس لئے یہیں سے تنقیدی اصولوں پر بحث کا آغاز ہوا جو آگے چل کر تنقید پر لکھی جانے والی دیگر کتابوں کے لئے زیادہ سے زیادہ مواد فراہم کرتا رہا۔ حالؔی نے اپنی کتاب مقدمہ شعر و شاعری میں

زیادہ تر مثالیں یا حوالے عربی شاعروں کے دیئے اور ان کی پوری تنقید پر صرف اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ عرب کے تمام شاعروں نے جھوٹ سے پرہیز کیا ہے اور سچائی کے اظہار کو ہی اپنے اظہار کا وسیلہ بنایا ہے جبکہ ہماری اردو شاعری جھوٹ اور مبالغہ سے بھری پڑی ہے مقدمہ شعر وشاعری کا اثر اس لئے زیادہ ہوا کہ اس سے پہلے شاعری کے بارے میں کھل کر کسی نے کچھ نہیں کہا تھا اتنی کھری کھری باتیں یہاں کے شاعروں نے کبھی نہیں سنی تھیں یعنی مقدمہ شعر وشاعری نے اردو شاعروں کو چونکانے کا کام زیادہ کیا۔ رہا عمل کا سوال تو خود حالؔی نے ایسی شاعری نہیں کی جس کی حمایت کر رہے تھے جس بات پر زور دے رہے تھے مثلاً انہوں نے یہ کہا کہ عرب کے تمام شاعروں نے جھوٹ سے پرہیز کیا ہے اس کی مثال اس طرح دی گئی کہ عرب کے ایک شاعر کی خوبی یہ تھی کہ وہ جس کی تعریف کر دیتا تھا وہ دن دونی رات چوگنی ترقی کرتا تھا اور وہ جس کی ہجو لکھ دیتا تھا وہ دنیا میں ذلیل وخوار ہو جاتا تھا ایک مرتبہ ایک سرمایہ دار شخص اس کے پاس آیا کہ یہ آپ کا نذرانہ لیجئے اور ذرا میری تعریف میں لکھ دیجئے کہ میں بہت بہادر ہوں ایسا ہوں ویسا ہوں تو اس شاعر نے کہا کہ پہلے آپ کوئی کارنامہ انجام دیجئے ورنہ میں ایسا کچھ نہیں لکھوں گا حالؔی نے پورا زور اس پر دیا لیکن خود اپنی شاعری کو ان باتوں سے دور رکھا اور وہی پرانی روایتی شاعری کرتے رہے کہنے کا مطلب صرف یہ ہے کہ اپنی رائے پیش کرنا یا تنقید کرنا آسان ہے اس پر عمل کر کے دکھانا مشکل ہے حالؔی کے بعد شبلی نعمانی نے اردو تنقید میں اپنی علمی قابلیت کے زور پر اتنا کچھ اضافہ کیا تنقیدی سرمایہ اتنا قیمتی ہو گیا کہ اردو شاعری کا نقشہ ہی بدل گیا تمام شاعروں ادیبوں کے خیالات اور ان کی تخلیقات میں نیاپن دکھائی دینے لگا۔ حالؔی نے عربی شاعری کے حوالوں سے اردو زبان کو ایک نئی سوچ دی تو شبلی نے فارسی شاعری کے تمام دفاتر کھنگال ڈالے اس طرح تنقید میں دن بدن اضافہ ہوتا گیا اور اردو تنقید منزل بہ منزل ترقی کے زینے طے کرتی رہی اور پھر بہت جلد ہمارے اردو کے بیشتر نقادوں کو تنقید کو نیا راستہ دکھایا۔ جب تنقید تخلیق پر حاوی ہو گئی تو

زیادہ تر نقادوں نے مغربی ادب کو اردو میں پیش کرنا شروع کر دیا۔ اور زیادہ تر تنقید مغربی افکار سے مالا مال ہوتی رہی جب ہر نقاد سب کچھ کہہ چکا تو پھر اپنے اپنے خول میں بند یا اپنا راستہ اپنا کر اپنی اپنی دنیا میں کھو گئے تنقید میں اپنا نام پیدا کرنے کے بعد نقادوں نے خاموشی اختیار کر لی مثلاً وارث علوی نے سعادت حسن منٹو اور راجندر سنگھ بیدی سے ہٹ کر کسی اور طرف نہیں دیکھا شمس الرحمٰن فاروقی نے جدیدیت کا علم سنبھال لیا اور کچھ مخصوص یعنی اپنے حلقے کے لوگوں کو اٹھانے میں لگ گئے۔ شمیم حنفی قرۃ العین حیدر کی مدح سرائی میں لگ گئے حامدی کاشمیری اکتشافی تنقید میں تو قمر رئیس پریم چند کے ہو کر رہ گئے اور بے چارے نئی نسل کے درجنوں فنکاران سب نقادوں کا منہ تکتے رہ گئے چاہے وہ نئے کہانی کار ہوں یا نئے شاعر ہوں ایسے میں ایک دانشور دور اندیش نقاد پروفیسر گوپی چند نارنگ کو خیال آیا انہوں نے نئی نسل کے مسائل کو نہ صرف دل سے محسوس کیا بلکہ عملی طور پر کام کر کے دکھایا اور نئی نسل کو مابعد جدیدیت کے نام سے اکٹھا کر کے انہیں اپنی بات کہنے اور اپنا حق مانگنے کے لئے نیا پلیٹ فارم دیا۔ مانا کہ مابعد جدیدیت کی شروعات 100 سال یا 50 سال پہلے ہو چکی ہو لیکن اردو میں اسے کتنے لوگ جانتے تھے بعد میں تو سب ہی کہنے لگے کہ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے لیکن پہلے کیوں یہ سوال نہیں اٹھائے تھے۔ ظاہر ہے کہ اس کے لئے دماغ چاہئے عقل چاہئے دور اندیشی چاہئے جرأت چاہئے اور اس کا فقدان یہاں ہر بڑے نقاد میں تھا ورنہ وہ بھی یہ سوال اٹھا سکتے تھے پروفیسر گوپی چند نارنگ میں ہمت تھی علم تھا تو انہوں نے نہ صرف یہ معاملہ اٹھایا بلکہ سب کچھ کر کے دکھایا۔

یوں تو اردو تنقید پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے سینکڑوں مضامین سینکڑوں کتابیں اب تک شائع ہو چکی ہیں لیکن نقادوں کی اس بھیڑ میں ایک نام ایسا ہے جس نے اردو تنقید کو اتنا کچھ دیا ہے کہ اردو زبان مالا مال ہو گئی اور وہ نام ہے پروفیسر گوپی چند نارنگ کا۔ پروفیسر نارنگ نے ادب میں نئے رجحانات کا استقبال کیا ہے اور پھر اپنے نظریات

اپنے خیالات اپنے افکار سے زبان کو نکھارنے، سنوارنے میں اپنی زندگی صرف کردی ہے۔ اردو مابعد جدیدیت پر مکالمہ بھی اسی نوعیت کی کتاب ہے جب ادب پر جمود طاری ہوگیا اور جدیدیت جو ادب میں ایک وبا کی طرح پھیل گئی تھی جس نے ادب کے نام پر ایک ایسا زبردست کباڑ خانہ جمع شروع کرنا شروع کردیا کہ لوگ بیزار ہوگئے، نئی نسل انتشار کا شکار ہوگئی جو جنوئن فنکار تھے انہیں اپنا مستقبل خطرے میں نظر آنے لگا کہ ان کا کوئی پرسان حال نہ تھا ایسے میں ایک ایسے ذہین دانشور نقاد کو احساس ہوا کہ یہ کچھ ہورہا ہے غلط ہورہا ہے، جدیدیت کے بانی معتبر نقاد شمس الرحمٰن فاروقی نے جب نئی نسل کے لکھنے والوں کو نظرانداز کرتے ہوئے یہ کہا کہ نئی نسل کیوں ہمارا منہ تکتی ہے، اسے اپنا نقاد خود پیدا کرنا چاہئے پھر تو ادب میں واویلا مچ گیا، ایسے میں پروفیسر گوپی چند نارنگ نے ان کی سرپرستی کی اور انہیں یعنی نئی نسل کے اچھے لکھنے والوں کو ایک پلیٹ فارم دیا جسے مابعد جدیدیت کا نام دیا اور 1997 میں اردو کا بدلتا منظرنامہ مابعد جدیدیت اردو کے تناظر میں ایک زبردست انٹرنیشنل سیمینار منعقد کیا جس میں جدیدیت مابعد جدیدیت سے تعلق رکھنے والے نئی نسل کے ساتھ تمام اہم لکھنے والوں کو ایک جگہ جمع کیا اور انہیں بولنے لکھنے اور گفتگو کرنے کا موقع دیا کہ وہ کھل کر اپنی بات کہہ سکیں اس سیمینار کا اثر اتنا ہوا کہ نئی نسل کو اپنی حیثیت اپنا مقام اپنی صلاحیتوں کو سنوارنے کا ایک بہترین ذریعہ مل گیا، یہیں سے مابعد جدیدیت کے تعلق سے لکھا جانے لگا، بحث کے لئے دروازے کھلے اور یہ سب عظیم نقاد دانشور مفکر پروفیسر گوپی چند نارنگ کی قربانیوں سے ہوا، سیمینار کی تجاویز بیان کرتے ہوئے پروفیسر گوپی چند نارنگ نے اپنی تقریر میں کہا:

> "اس وقت پوری دنیا جدیدیت کے بعد کے دور میں داخل ہوچکی ہے اور ہندوستان میں بھی اس سے باہر نہیں اسے بالعموم مابعد جدیدیت کا دور کہا جارہا ہے، یہ تاریخی صورتحال بھی ہے نیز ادب آرٹ اور فکر کے نئے رویوں کے لئے بھی اس اصطلاح کا استعمال

کیا جارہا ہے، مابعد جدیدیت ایک کھلی ڈلی اصطلاح ہے جس کی کوئی بندھی ٹکی تعریف نہیں یہ ہر طرح کی فارمولہ سازی، نظریوں کی مطابقت اور ادعائیت نیز کسی بھی نوع کے دیئے گئے منصوبہ بند پروگرام کے خلاف ہے یعنی سیاسی ...... ہی نہیں ادبی ...... دینا بھی اتنا ہی نقصان دہ ہے اور تخلیقی آزادی کے منافی ہے۔ ادھر برصغیر اور ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ کے ممالک میں تقریباً ہر جگہ اپنے اپنے تشخص اور ثقافتی حوالے پر اصرار بڑھا ہے، نئی سوچ اور نئی ادبی تھیوری، فلسفہ ادب جو تکثیریت پر مبنی ہے ثقافتی حوالے پر خاص طور سے زور دیتی ہے کہ زبان و ادب میں تخلیقیت اور معنی خیزی کا عمل اپنی تہذیب کی رو سے ہی ممکن ہے نیز جمالیات ہو یا شعریات یا تخلیقی تبدیلیاں یہ سب معنی حاصل کرتی ہیں اپنی ہی تہذیب کی بناء پر اور اس کے حدود کے اندر چنانچہ مابعد جدیدیت دور میں ہماری تبدیلیاں ضروری نہیں کہ مغرب کا عکس ہوں یہ خود ہماری روایت اور ہماری ثقافتی ضرورتوں کی زائیدہ ہوں گی، ان کی تشکیل، ان کا تعین اور ان کی تعریف اردو کی اپنی ہوگی۔''

پروفیسر گوپی چند نارنگ کی کسی بھی تحریر کا ایک ایک جملہ پڑھ لیجئے ہر جملہ ایک معنویت لئے ہوتا ہے۔ مابعد جدیدیت سے متعلق اس رائے کو پڑھ کر اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ نارنگ صاحب نے کتنا مطالعہ کیا ہے۔ لوگ ادب پڑھتے ہیں ادب لکھتے ہیں، چھپتے ہیں اور اپنے عہدوں اپنے اثر رسوخ کے ذریعہ عارضی شہرت کے مالک بھی بن جاتے ہیں لیکن نارنگ صاحب کا معاملہ دوسرا ہے، انہوں نے ادب پڑھا بھی ہے، لکھا بھی ہے بلکہ یوں کہنا چاہئے جیا بھی ہے۔ ان کا ہر لمحہ ادب پڑھتے لکھتے اور سوچتے گزرا ہے، ان کے یہاں بناوٹ کہیں نہیں ہے، جو کچھ سوچتے ہیں وہ بے خوف لکھتے ہیں، ادب

میں نئی نئی راہیں اور نئے نئے پہلو تلاش کرتے ہیں، نارنگ صاحب ان دانشور نقادوں میں سے ایک ہیں جنہوں نے کبھی ادب پر جمود طاری نہیں ہونے دیا۔ بقول ان کے ادب پنپتا ہے اجتہاد سے، اختلاف سے۔ مابعد جدیدیت سے متعلق انہوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ اس کا زندہ ثبوت ہے کہ ترقی پسند تحریک کے عروج اور زوال کا منظر ان کے سامنے، تھا اس کی وجوہات سے بھی وہ واقف تھے پھر انہوں نے جدیدیت کا عروج بھی دیکھا اور جدیدیت سے متعلق جو کچھ لکھا گیا وہ بھی ان کے سامنے موجود تھا لیکن ترقی پسند تحریک سے تو بڑا فائدہ یہ ہوا کہ اس تحریک نے اردو ادب کو بہت کچھ دیا ہے بہت بڑے نام جو اردو ادب کا آج ستون کہلاتے ہیں خاص طور پر فکشن کے بہت سے اہم نام ترقی پسند تحریک کی ہی دین ہیں۔ جدیدیت نے ایسا کوئی بڑا کارنامہ انجام نہیں دیا کہ وہ ترقی پسند تحریک کا مقابلہ کر سکے یا وہ ساری تحریریں جو ترقی پسند دور میں لکھی گئیں جدیدیت سے متعلق کوئی بھی ایسی تحریر اس کے معیار اور مرتبہ کی نہیں ہے، یوں تو شاعری ہو یا ادب کی دیگر اصناف ہوں ہر آنے والا دور جدید ہوتا ہے۔ حالؔی نے روایت سے بغاوت کر کے مقدمہ شعر و شاعری کے ذریعہ تنقید کی بنیاد ڈالی اور شاعری کے لئے سچ کے اظہار پر زور دیا اور عربی شاعری کی مثالیں دے کر یہ بات واضح کردی کہ عرب کے تمام شاعروں نے جھوٹ سے پرہیز کیا ہے۔ اس کے بعد شبلی نعمانی نے شعر العجم لکھ کر فارسی کے تمام اہم شاعروں کے حوالوں سے کچھ شعری اصناف اور اس کے معیار پر گفتگو کی اس کے بعد ترقی پسند تحریک کا زمانہ آیا یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہر نقاد نے دنیا کی دیگر شاعری اور دوسری زبانوں کے ادب کو اردو شاعری سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہاں یہ بات ذہن نشین رکھنا چاہئے کہ ہر ملک کی تہذیب الگ ہوتی ہے وہاں کا ماحول زبان، رہن سہن، طور طریقے رسم و رواج کا اثر وہاں کے ادب اور شاعری میں دکھائی دیتا ہے۔ ہندوستان ایک ایسا بڑا ملک ہے جس کی روایات لوک کتھاؤں اور دیومالائی قصوں سے بھری پڑی ہیں اور کوئی بھی ادب اپنے ملک، اپنی تہذیب سے ہٹ

کر یا اپنی تہذیب سے بیگانہ رہ کر بڑا ادب تخلیق نہیں کر سکتا۔ شیکسپیئر ہوں یا ملٹن ہوں ہم ان کا موازنہ میرؔ، غالبؔ سے نہیں کر سکتے لیکن بیشتر نقادوں نے قاری کو اپنی علمیت اور قابلیت سے مغربی ادب یا فارسی یا عربی ادب کی مثالیں دے دے کر قاری کو اتنا مرعوب کر دیا کہ جس سے نقادوں کی دھاک تو بیٹھ گئی لیکن بہت سے اچھے شاعر ادیب نقادوں کی ان الجھی ہوئی باتوں سے اچھی تخلیق سے محروم ہوتے چلے گئے، کوئی ارسطو کے حوالے دیتا ہے، کوئی افلاطون کی باتیں کرتا ہے لیکن وہ جس ملک میں رہتا ہے اس کی روایت پر نظر نہیں ڈالتا مثال کے طور پر اردو شاعری کے امام میر تقی میرؔ کو لے لیجئے یا ہندوستان کے دو عظیم شاعر تلسیؔ یا کبیرؔ کو لے لیجئے جن کے پاس نہ کوئی ڈگری تھی نہ انہوں نے ارسطو، افلاطون کو پڑھ کر شاعری کی تھی بلکہ کبیرؔ نے تو یہ کہا تھا کہ

جگ بھوگا گاوے سو کیا گاوے

انھو گاوے سو راگی ہے

بس یہی نقطہ ایک ایسا ہے جس پر ہمارے پورے ادب کی اساس قائم ہے، یعنی زندگی کی سچائیاں۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ کی بھی یہی سب سے بڑی خوبی ہے کہ انہوں نے اپنی تنقید کی اساس ہندوستانی تہذیب پر رکھی ہے، تنقید کی جڑیں ہندوستانی تہذیب میں تلاش کی ہیں، مغربی ادب کو پڑھا تو انہوں نے بہت ہے لیکن اس کی بنیاد یہاں کی تہذیب میں تلاش کی ہے۔ صوفی، سنتوں، کے قول اور ان کی زندگی کو آئینہ بنا کر ادب میں ادب کی ساری روایتوں کو کھنگال کر روشناس کرایا ہے اور اپنی آدھی زندگی اس میں صرف کی ہے تب کہیں جا کر ہندوستانی قصوں سے ماخوذ اردو مثنویاں، ''ہندوستان کی آزادی اور اردو شاعری'' اور ''غزل اور ہندوستانی ذہن و تہذیب'' جیسی اہم کتابیں لکھ کر نارنگ صاحب نے اردو تنقید کا حق ادا کر دیا بلاشبہ وہ اس عہد کے ایسے دانشور نقاد ہیں کہ جن کی تحریروں میں ہندوستان کی عظمت چھپی ہوئی ہے یہی وجہ ہے کہ دنیا کے تمام رسالوں، اخباروں، ریڈیو، ٹیلی ویژن اور سینکڑوں کتابوں میں ان کے نام کا ڈنکا بج رہا

ہے۔ درجنوں رسالوں کے مدیروں نے ان کی خدمات کو دیکھتے ہوئے ان پر خصوصی نمبر نکالے مثلاً ماہ نامہ انشاء، سہ ماہی اسباق، سہ ماہی پہچان، کے علاوہ ہندوستان پاکستان کے کئی معتبر رسالوں نے کسی نے ان پر کتاب لکھی کسی نے ان پر سینکڑوں مضامین جمع کر کے کتابیں ترتیب دیں مثلاً شہزاد انجم نے 900 صفحات پر مشتمل کتاب شائع کی اسی طرح اطہر عزیز نے ان کے منتخب مضامین پر مشتمل کتاب شائع کی۔ ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں بھارت سرکار کے علاوہ دنیا کی دیگر ادبی تنظیموں نے بے شمار اعزازات سے نوازا۔ ابھی حال ہی میں سہ ماہی استعارہ کا انتساب پروفیسر گوپی چند نارنگ کے نام ہے جس میں لکھا ہے۔

''ہمدم دیرینہ مشفقی ومکرمی پروفیسر گوپی چند نارنگ کے نام۔

جنہیں اس سال صدر جمہوریہ ہند نے پدم بھوشن کا اعزاز دے کر ان کی قدر افزائی ہی نہیں کی بلکہ اردو کی توقیر بھی بڑھائی ہے۔ بالعموم کسی دانشور یا نقاد کے حصے میں ایسا وقیع اعزاز کم ہی آتا ہے گوپی چند نارنگ صاحب اپنی دانشورانہ فکر کے لئے جو امتیاز رکھتے ہیں جتنا خوبصورت لکھتے ہیں جتنا خوبصورت بولتے ہیں اور جس جرأت و پامردی سے وہ اردو زبان و ادب کے لئے سینہ سپر رہتے ہیں اس کے پیش نظر ممتاز ادیب کملیشور کا یہ کہنا مبالغے پر مبنی نہیں بلکہ حقیقت بیانی کے ذیل میں آئے گا کہ ''ہندوستان کی ہر زبان میں ایک گوپی چند نارنگ کی ضرورت ہے۔'' واقعہ یہ ہے کہ گوپی چند نارنگ کی وجہ سے نہ صرف ہندوستانی زبانوں کی برادری میں بلکہ عالمی زبانوں کی برادری میں بھی اردو کا سر اونچا ہوا ہے نارنگ صاحب کا یہ اعزاز ان کا تو ہے ہی اردو والوں کا بھی ہے۔ اس لئے استعارہ کی جانب سے ہم ان کو اور اردو والوں دونوں کو مبارکباد دیتے ہیں۔

نہ رکھو کان نظم شاعرانِ حال پر اتنے
چلو ٹک میرؔ کو سننے کہ موتی سے پروتا ہے''
میر تقی میرؔ

یہ مختصر اقتباس پڑھ کر اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ نارنگ صاحب کی تنقید نگاری، ان کے مضامین، ان کی کتابیں اور ان کی دیگر تحریریں ادبی دنیا میں کیا مقام رکھتی ہیں اور خود نارنگ صاحب کا ادبی مقام و مرتبہ کیا ہے۔ ہمارے موضوع کا تعلق بھی گوپی چند نارنگ کی تنقید نگاری سے ہے کہ انہوں نے اردو تنقید کے ذریعہ، اپنی منفرد تحریروں کے ذریعہ اردو زبان و ادب کو کیا کچھ دیا ہے وہ بھی ان کی چند کتابوں کی روشنی میں اس لئے کہ ان کی ساری تحریریں اور ساری کتابیں پڑھنے کا حوصلہ تو مجھ میں نہیں ہے انہوں نے اتنا کچھ لکھا ہے کہ جسے پڑھنے کیلئے ایک عمر درکار ہے میں تو ایک طالب علم کی حیثیت سے ان کی چند کتابوں پر اظہار خیال کرنے پر اکتفا کر رہا ہوں ان میں سے ایک ''اردو مابعد جدیدیت پر مکالمہ'' ہے، اس کتاب نے مجھے ہی نہیں بلکہ نئی نسل کے سارے لکھنے والوں کو نہ صرف متاثر کیا ہے بلکہ انہیں نئی راہ دکھائی ہے، ویسے بھی نارنگ صاحب کی تقریر ہو یا تحریر وہ ادب کو بہت کچھ نیا دیتے ہیں، نئے پن کی تلاش اور کھوج کرنے کے بعد وہ دنیا کے سارے لکھنے پڑھنے والوں کو اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں اردو مابعد جدیدیت پر مکالمہ کے لئے سیمینار منعقد کر کے ہی انہوں نے نئے اور پرانے تمام لکھنے والوں کو ایک جگہ جمع کر کے اتنا کچھ دیدیا ہے کہ برسوں اس موضوع پر لکھا جاتا رہے گا اور گفتگو جاری رہے گی کہ یہی بات ادب میں اضافہ کا راز بھی ہوتی ہے اور اس راز سے پروفیسر گوپی چند نارنگ خوب واقف ہیں۔ مابعد جدیدیت پر مکالمہ ایک ایسی ہی کتاب ہے جس میں پروفیسر گوپی چند نارنگ کے چار اہم مضامین شامل ہیں پہلا ہے ''مابعد جدیدیت عالمی تناظر میں'' اس میں پروفیسر گوپی چند نارنگ نے مابعد جدیدیت کے تصور سے بحث کرتے ہوئے مابعد جدیدیت کی تھیوری سے بحث کی ہے اور شروع سے لیکر آج تک

ادب میں نئی تبدیلیوں پر زور دیتے ہوئے لکھا ہے۔

''مابعد جدیدیت کا سب سے بڑا سوال یہ ہے:

Has the Enlightenment project failed.

کیا روشن خیالی کا پروجیکٹ ناکام ہوگیا ہے؟ اکثر مفکرین یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ کیا روشن خیالی کا پروجیکٹ جو کلچرل موڈرن ازم کا حصہ تھا ہمیشہ کے لئے دم توڑ چکا یا اس میں کچھ جان باقی ہے۔ یہ پروجیکٹ اٹھارہویں صدی کے فلاسفہ کی امید پرور اور حوصلہ مندانہ فکر سے یادگار چلا آتا تھا جنہوں نے انسان کی ترقی کا خواب دیکھا تھا، اور یہ عبارت تھا سائنس کی معروضی پیش رفت سے، آفاقی اخلاقیات اور قانون کی بالادستی سے، اور ادب و آرٹ کی خودمختاری سے۔ توقع تھی کہ فطری اور مادی وسائل پر قدرت حاصل ہوجانے سے ذات اور کائنات کا عرفان بڑھے گا۔ عدل و انصاف اور اخلاق کا بول بالا ہوگا، امن و امان کا دور دورہ ہوگا اور انسان مسلسل ترقی کرتا جائے گا۔

لیکن روشن خیالی پروجیکٹ کے خوابوں کی تعبیر جو سامنے آئی ہے وہ نہ صرف حوصلہ افزا نہیں بلکہ مایوس کن ہے۔ عملاً سائنسی تکنیکی ترقی اور جدیدکاری کے ساتھ دنیا کا جو نقشہ ابھرا ہے وہ اس کا الٹ ہے جو سوچا گیا تھا بظاہر آسائشوں اور سازوسامان سے بھرپور زندگی اندر سے کھوکھلی اور بے تہہ ہوچکی ہے۔ فوری نتائج، کامیابی، منافع خوری، اقتدار کی ہوس، حاوی محرکات ہیں۔ خوشی اور مسرت منڈی کا مال ہیں اور ہر شے کمرشیل رنگ میں رنگ کر اپنی اصلیت سے محروم ہوگئی ہے۔ چنانچہ پس ساختیاتی مفکرین ہوں یا نئے فلسفی سب تاریخی ترقی کے سابقہ تصور کو چیلنج کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ بیشک انسان ترقی کررہا

ہے لیکن فقط کمیتی اعتبار سے، کیفیتی اعتبار سے نہیں۔ کیفیتی اعتبار سے انسان کی یا علم کی ترقی کی جو ضمانت دی گئی تھی، افسوس کہ وہ پوری نہیں ہوئی اور روشن خیالی پروجیکٹ اپنی شکست سے دوچار ہو چکا ہے۔''

پروفیسر گوپی چند نارنگ اردو کے ایک ایسے دانشور نقاد ہیں کہ وہ اپنی دور بینی سے آنے والے وقت اور ادب میں رونما ہونے والی تبدیلیوں پر نہ صرف گہری نظر رکھتے ہیں بلکہ ہر نئی تبدیلی کا خیرمقدم کرتے ہیں خود بھی نئے نئے گوشوں کی تلاش میں رہتے ہیں، دِنوں نہیں مہینوں غور کرتے ہیں اور ادب پڑھنے والوں اور ادب لکھنے والوں کو بھی غور فکر کی دعوت دیتے ہیں۔ یہ ان کی شخصیت کا ایک ایسا امتیازی پہلو ہے جو دوسرے نقادوں میں دور دور تک نظر نہیں آتا، یہ بات میں کسی عقیدت کے طور پر نہیں لکھ رہا ہوں نہ ادب میں عقیدت چلتی ہے نہ پیری مریدی چلتی ہے بلکہ ادب تو ایک ایسا کھرا اور کھوٹا سکہ کی طرح ہوتا ہے جو اصلی اگر ہے تو چلتا ہے ورنہ اس کی کوئی قیمت نہیں ہوتی۔ پروفیسر نارنگ کی شخصیت، علمیت اور قابلیت ان کی تحریروں تقریروں اور کتابوں میں [illegible] پر دیکھی جا سکتی ہے۔ دوسری اہم خصوصیت ان میں یہ ہے کہ وہ ہر نئے اور باصلاحیت لکھنے والے پر اس کی تحریروں پر اس کے کاموں پر گہری نظر رکھتے ہیں جہاں انہوں نے روایتی ادب اور دیگر زبانوں کے ادب کا گہرا مطالعہ کیا ہے وہیں دوسری طرف وہ نئی نسل کے اور نئے ادب کو بھی نہ صرف پڑھتے ہیں بلکہ اس پر کھل کر اظہار خیال بھی کرتے ہیں خاص طور پر وہ ان نئے اور کھلے ذہن کے لکھنے والوں یعنی کشادہ [illegible]نوں کے نوجوانوں سے زیادہ گفتگو کرتے ہیں۔ ان کے مسائل کو سمجھتے ہیں ان پر لکھتے [illegible] ان کا حل بتاتے ہیں۔ مابعد جدیدیت پر مکالمہ، سیمینار اور سیمینار میں پڑھے جانے [illegible]ے تمام مقالوں پر مشتمل کتاب ''مابعد جدیدیت پر مکالمہ'' اس بات کا زندہ ثبوت [illegible]ے۔ اس کتاب میں ان تقریروں پر مشتمل جو مضامین شامل ہیں ان کے عنوانات پر ہی [illegible]یک نظر ڈالتے ہیں یعنی ''مابعد جدیدیت عالمی تناظر میں''، دوسرا ''ترقی پسندی،

جدیدیت، مابعد جدیدیت''۔ اس مضمون میں انہوں نے ترقی پسندی کے زوال، جدیدیت کے عروج اور پھر مابعد جدیدیت کی ابتداء پر کھل کر گفتگو کی ہے اور اس میں یہ بات واضح کردی ہے کہ مجھے ان تینوں میں سے کسی سے کوئی ذاتی دشمنی نہیں ہے، اس سلسلہ میں وہ لکھتے ہیں:

''ترقی پسندی، جدیدیت، مابعد جدیدیت''

''ان تینوں میں سے کوئی بھی میرا ذاتی مسئلہ نہیں، ترقی پسندی، جدیدیت نہ مابعد جدیدیت، لیکن اس وقت صورت حال کیا ہے، کیا ہو رہا ہے اور ہم کدھر جا رہے ہیں؟ نئی نسل کے لکھنے والے بالخصوص ستر پچھتر کے بعد اُبھرنے والے شاعر و افسانہ نگار کیوں بار بار اپنی برأت کا اظہار کرتے ہیں، کیوں کہتے ہیں کہ وہ نہ جدیدیت کا حصہ ہیں نہ ترقی پسند تحریک کا، بلکہ ان کی پہچان الگ ہونی چاہئے کیونکہ وہ اگلوں سے الگ ہیں۔ لیکن مزے کی بات یہ ہے کہ اگلوں کی صفوں سے جواب آتا ہے کہ وہ اگلوں سے الگ نہیں اور ان کی کوئی الگ پہچان نہیں اور وہ اگلوں کا ہی حصہ ہیں۔ اور نئے بہر حال یہ بالاصرار کہتے ہیں کہ وہ ان کا حصہ نہیں۔ یہ صورت حال دلچسپ ہو نہ ہو انوکھی ضرور ہے۔ اس سے پہلے جب جب بھی تحریکیں بدلی ہیں یا میلانات تبدیل ہوئے ہیں کشاکش تو ہوئی ہے لیکن اس نوع کا کنفیوژن کبھی نہیں پھیلایا گیا۔ گویا تاریخ اپنے آپ کو دہراتی بھی ہے اور نہیں بھی دہراتی، کیونکہ اس طرح کی سچویشن فقط موجود کا مسئلہ ہے ماضی میں ایسا کبھی نہیں ہوا۔ ایسے مضامین ہندوستان میں اور پاکستان میں بھی برابر شائع ہو رہے ہیں جن میں جدید تر غزل یا جدید تر افسانے سے بحث کی

جاتی ہے۔ ان میں جن خصوصیات پر زور دیا جاتا ہے ان میں سے
بعض مشترک بھی ہیں اس کا بھی احساس عام ہے کہ ترقی پسند
تحریک تو بہت پہلے دم توڑ چکی تھی اب جدیدیت بھی بے جان اور
بے اثر ہو چکی ہے لیکن جدیدیت کے ایک حلقے سے اس کی تردید
بھی کی جاتی ہے یہ بھی حقیقت ہے کہ کسی تحریک کے نام لیوا اس
تحریک کی پسپائی کا اقرار کرنے کو آسانی سے تیار نہیں ہوتے۔
خصوصاً جب وہ اس کے قافلہ سالار بھی رہے ہوں۔''

اس مضمون میں انہوں نے صاف طور پر یہ کہہ دیا ہے کہ نہ مجھے ترقی پسندی سے چڑھ ہے نہ جدیدیت سے بغض، نہ میں مابعد جدیدیت کا علمبردار بننا چاہتا ہوں۔ میرا مقصد تو یہ ہے کہ ترقی پسندی کا زوال ہو چکا ہے اور اگر جدیدیت ختم نہیں ہوئی ہے تو پھر نئی نسل کے لکھنے والے کیوں دونوں سے بیزار ہیں وہ کیوں یہ کہتے ہیں کہ ہمیں جدیدیت یا ترقی پسندی سے کوئی لینا دینا نہیں ہے بس یہی خاص پہلو ہے جسے نارنگ صاحب نے دل سے محسوس کیا نئی نسل کے مسائل کو سمجھا سنا اور ایک زبردست سیمینار منعقد کیا کتاب شائع کی اور نئی نسل کے ہر اس فنکار کو اپنی بات کھل کر کہنے کا موقع فراہم کیا اور نام دیا مابعد جدیدیت۔ اس طرح اس کتاب میں جو چار مضامین نارنگ صاحب کے شامل ہیں ان میں سب سے آخری مضمون مابعد جدیدیت کے حوالے سے ''کشادہ ذہنوں اور نوجوانوں سے کچھ باتیں'' بہت اہمیت رکھتا ہے پورے سیمینار کی بنیاد اسی مضمون پر ہے اور مابعد جدیدیت کے حوالے سے نارنگ صاحب نے کشادہ ذہنوں اور نوجوانوں سے جو باتیں کہی ہیں وہ بہت اہم اور نئی نسل کو راہ دکھانے والی ہیں۔ ان کے ذہنوں کی نشو ونما کیلئے اور ادب میں نئے اور بدلتے رجحانات کا خیر مقدم کرنے کے لئے انہیں قبول کرنے کے لئے نارنگ صاحب کی اس تحریر میں یہ تمام باتیں اجاگر کی گئیں ہیں۔ اور مابعد جدیدیت کو اگر نظر انداز بھی کر دیا جائے تب بھی وہ باتیں جو نارنگ

صاحب نے نوجوانوں سے کہیں ہیں وہ نئی نسل کیلئے مشعل راہ ثابت ہوں گی، یعنی جنریشن گیپ اور فوری پیشروؤں سے انکار جو کہ نئی نسل کا ان دنوں رویہ ہے۔ نارنگ صاحب نے یہی تمام باتیں اور نئی نسل کے مسائل کو موضوع بنا کر پورے اردو ادب میں چھائے ہوئے جمود کو نہ صرف توڑا ہے بلکہ ادب میں ایک نئے دور کا آغاز کیا ہے۔ یہاں بہت سے ایسے نقادوں کے خیالات اور نظریات سے بھی بحث کی جاسکتی ہے جنہوں نے نئی نسل کو نہ کوئی اہمیت دی نہ ان کی صلاحیتوں کا اعتراف کیا نہ انہیں ادبی تاریخی حوالوں میں شامل ہونے کا اہل سمجھا۔ یہاں شمس الرحمٰن فاروقی صاحب کی اس رائے کو پیش کرنا ضروری ہے جو انہوں نے نئی نسل کو مخاطب کرتے ہوئے کہی ہے، وہ لکھتے ہیں:

> ''مجھے اس بات سے کوئی خوف نہیں آتا کہ نئے لکھنے والے جدیدیت سے انحراف کریں گے یا کرنا چاہیں گے۔ ادبی اصول و نظریات کو میں ترقی پسندوں کی طرح مطلق اور آفاقی اور ہمہ وقتی نہیں سمجھتا، میں امید کرتا ہوں کہ ادب کے بارے میں کئی طرح کے نظریات صحیح ثابت ہوسکیں گے۔ جدیدیت کوئی مذہب نہیں کوئی الہامی فلسفہ نہیں، جس سے انحراف کفر ہو۔ ...ایک دن وہ بھی ہوگا جب جدیدیت اپنا کام اچھا برا کر چکے گی، کوئی اور نظریہ ادب اس کی جگہ لے گا میں اس دن کا منتظر ہوں۔''

ہماری ادبی صورت حال ''شب خون''

فاروقی صاحب کی اس رائے کو غور سے پڑھا جائے تو ایک بات یہ سامنے آتی ہے کہ جدیدیت کے بعد مابعد جدیدیت کوئی معنیٰ نہیں رکھتی اس لئے کہ جدیدیت تو ہر دور میں رہی ہے اور رہے گی ہر نیا دور جدید ہوتا ہے یہاں اس بحث کو چھوڑتے ہوئے فاروقی صاحب کی اس رائے کی آخری لائن قابل توجہ ہے کہ جدیدیت کے بعد کوئی اور

نظریہ ادب اس کی جگہ لے لے گا میں اس کا منتظر ہوں۔ ظاہر ہے مابعد جدیدیت بھی ایک نظریہ ادب کی حیثیت سے اب زیر بحث ہے اور رائج ہوتا جا رہا ہے اور نئی نسل کیلئے ایک پلیٹ فارم ہے اور اس مابعد جدیدیت کا سہرا پروفیسر گوپی چند نارنگ کے سر ہے۔ اور یہی وہ نظریہ ہے جس کی طرف فاروقی صاحب نے اشارہ کیا ہے۔ مابعد جدیدیت پر اب لکھنے لکھانے کا سلسلہ شروع ہو چکا ہے درجنوں مضامین کتابیں شائع ہو چکی ہیں اور ہو رہی ہیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ مابعد جدیدیت کیا ہے؟ تو اس سلسلہ میں عرض کرنا یہ ہے کہ عام قاری کو نہ جدیدیت سے سروکار ہے نہ مابعد جدیدیت سے ہر اچھی چیز اچھی ہوتی ہے بری بری ہوتی ہے تنقید کی درجنوں اصطلاحوں سے قاری کو کوئی دلچسپی نہیں ہے حد تو یہ ہے کہ چند نقادوں کے علاوہ سینکڑوں شاعر ادیب ایسے ہیں جنہیں یہ سب کچھ نہ تو پڑھنے لکھنے کی فرصت ہے نہ اس فلسفہ میں الجھنے کی۔ نقصان صرف ایسے جنوئن فنکاروں کا ہوتا ہے جو اچھا لکھ رہے ہیں جو کسی گروپ میں نہیں ہیں جو کسی تحریک میں شامل نہیں ہیں لیکن زیادہ تر نقاد اپنے اپنے گروپ کے لوگوں کو اٹھانے کا کام انجام دے رہے ہیں اور انہیں ہائی لائٹ کر رہے ہیں۔ اسی ناانصافی نے نئی نسل کے سچے تخلیق کاروں کو ذہنی انتشار میں مبتلاء کر رکھا تھا ان کا کوئی گروپ نہیں تھا ان کی کوئی تحریک نہیں تھی۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ نے انہیں مابعد جدیدیت کا ایک ایسا بینر دیدیا کہ جس کے جھنڈے تلے ایسے تمام فنکار جمع ہو گئے جنہیں اب تک کوئی لائن نہیں مل رہی تھی جن کی ادبی صلاحیتوں کو کوئی پوچھ نہیں رہا تھا اور ہر بڑا نقاد نظر انداز کر رہا تھا جب پروفیسر گوپی چند نارنگ نے مابعد جدیدیت کے عنوان سے ایک بڑا سیمینار کیا اور ہر نئے اچھے لکھنے والے کو بولنے اور لکھنے کا موقع فراہم کیا تو اس کی گونج سے ادب میں ایک زلزلہ پیدا ہو گیا۔ اور لوگوں نے مابعد جدیدیت کو اور پروفیسر گوپی چند نارنگ کو عجیب عجیب الزامات لگا کر یہ لکھنا شروع کر دیا کہ مابعد جدیدیت تو مغرب میں 100 سال پہلے اپنا کام ختم کر چکی ہے اس میں کون سا نیا پن ہے، کسی نے کہا یہ اسلام کے خلاف ایک سازش ہے

جس کے بارے میں اسلام دشمن رشدی اپنی کتاب میں پہلے ہی لکھ چکا ہے۔ غرض یہ کہ ادب میں ایک واویلا مچ گیا ویسے بھی ڈاکٹر وزیر آغاز اور پروفیسر گوپی چند نارنگ کے بارے میں پہلے بھی کچھ عجیب عجیب باتیں لکھی جا چکی ہیں جبکہ اردو دنیا میں یہ دونوں عظیم نقاد کی حیثیت سے اتنا بلند مقام و مرتبہ رکھتے ہیں کہ دوسروں کو تمام زندگی گزارنے کے بعد بھی حاصل نہیں ہوسکتا۔ یہاں ہمیں تنقید یا نقادوں کی رائے سے بحث نہیں کرنا ہے نہ ہمارا مقصد کسی نقاد کے مقام و مرتبہ کا تعین کرنا ہے ہمیں تو صرف یہ دیکھنا ہے کہ اردو کے عظیم نقاد پروفیسر گوپی چند نارنگ نے اردو تنقید کے حوالے سے، اپنے نظریات، اپنے خیالات سے زبان کو کتنا مالا مال کیا ہے، اردو زبان و ادب کو کیا کچھ دیا ہے، کتنا اضافہ کیا ہے، اتنی ہر دلعزیزی مقبولیت اور شہرت انہیں کن وجوہ سے حاصل ہوئی کہ آج نئی نسل کے تمام اچھے لکھنے والے ان کو اپنا آئیڈیل تصور کرنے لگے۔ ان کی تقریر اور تحریر کے جادو کا اثر ان کے دوستوں اور دشمنوں پر یکساں ہوتا ہے اور ہر شخص ان سے نہ صرف متاثر ہوتا ہے بلکہ ان کی قابلیت اور صلاحیتوں کا معترف ہوتا ہے۔ ان کی مقبولیت اور شہرت کا آخر راز کیا ہے۔ دنیا میں شہرتیں آدمی کو یوں ہی نہیں مل جاتیں بلکہ تمام عمر کی محنت اور قابلیت کا صلہ ایک عمر کے بعد ملتا ہے۔ نارنگ صاحب نے اپنی پوری زندگی لکھنے اور پڑھنے میں گزاری ہے اور اردو تنقید میں اپنی قابلیت و علمیت سے ایسے ایسے نادر نمونے پیش کیے ہیں جسے اردو زبان میں ایک ایسا اضافہ قرار دیا جا سکتا ہے، جس نے اردو ادب کی تاریخ کو مکمل کرنے میں اپنی زندگی صرف کردی ہو، چھوٹوں پر شفقت کی ہو، بڑوں کا احترام کیا ہو اور دوسروں کی عیب جوئی کرنا یا مقابل آکر اس کے خلاف جنگ چھیڑنا ان تمام باتوں سے گریز کرتے ہوئے اپنے آپ کو صرف لکھنے اور پڑھنے میں مصروف رکھنا گوپی چند نارنگ کا ہمیشہ معمول رہا ہے یہی تمام باتیں آگے چل کر ان کی شہرت ہر دلعزیزی اور ایک نادر شخصیت کی حیثیت سے ادب میں مقام مرتبہ پانے میں ایک اہم رول ادا کرتی ہیں۔ آیئے ساری بحث کو چھوڑتے ہوئے پروفیسر گوپی چند

نارنگ کی تنقید اور ان کی دیگر تحریروں پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔

مابعد جدیدیت کے حوالے سے کشادہ ذہنوں اور نوجوانوں سے کچھ باتیں کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

''میرا موقف تو سب کو معلوم ہے کہ بے شک میں نے خود کو بدلا ہے جب علم کے منطقے بدلتے ہیں تو مقدمات بدلتے ہیں، مقدمات بدلتے ہیں تو اقدار بدلتی ہیں، اقدار بدلتی ہیں تو ترجیحات بدلتی ہیں، پسند ناپسند بدلتی ہے۔ ارتقا ذہنِ انسانی کا خاصہ ہے۔ اپنا احتساب کرنے اور غور کرنے والے ذہن ہمیشہ بدلتے ہیں۔ بہنے والا پانی بدلتا ہے، ٹھہرا ہوا پانی البتہ نہیں بدلتا لاکان، بارتھ، فوکو، لیوتار سب بدلے ہیں۔ کیا وٹگنسٹائن نے خود کو نہیں بدلا تھا؟ تبدیلی کبھی کبھی ناگزیر ہو جاتی ہے۔ کیا اقبال، عسکری، آل احمد سرور نے خود کو نہیں بدلا تھا؟ اور تو اور جدیدیت کے ہراول دستے میں کیا باقر مہدی، خلیل الرحمٰن اعظمی، وارث علوی اور ان کے ساتھ کئی دوسروں نے خود کو نہیں بدلا تھا۔ ادب میں ایسے زمانے آتے ہیں جب ہر سوچنے والا انسان بدلتا ہے، یہ گناہ نہیں، نہیں بدلتے تو پتھر نہیں بدلتے یا وہ لوگ جو اپنے تحفظات یا مقتدرات کے باعث ادب کے تئیں ایماندار نہیں رہتے۔

یہ اضافہ بھی کرتا چلوں کہ تھیوری ہو یا مابعد جدیدیت، ساختیات پس ساختیات ہو یا ردتشکیل، میں خود کو ان کا ٹھیکیدار بھی نہیں سمجھتا کہ عمر زید بکر اس کے خلاف کچھ لکھے تو میں اس کو اپنا ذاتی مسئلہ بنا لوں۔ جس کو جو لکھنا ہو جی بھر کر لکھے۔ میں رائے

دے چکا، میں وکیل نہیں کہ صفائی میں جرح کرتا پھروں۔ اکیلے میں نے ہی نہیں دوسروں نے بھی لکھا ہے۔ بات میں وزن ہوگا تو زندہ رہے گی ورنہ کالعدم ہوجائے گی۔ آپ کے میرے چاہنے یا اس لابی اُس لابی سے کچھ نہیں ہوتا۔ میرا کام سوال اٹھانا، افہام و تفہیم کرنا، گرہیں کھولنا، نئے مسائل کے تئیں ترغیب ذہنی پیدا کرنا، علمی فضا بنانا، اردو میں نئے خیالات کا خون داخل کرنا، نئے ڈسکورس کے دریچے وا کرنا ہے اور بس کوئی سمجھے تو خوب نہ سمجھے تو خوب۔ میرا کوئی مقتدرہ، کوئی اسٹیبلشمنٹ نہیں کہ میرا کوئی مفاد وابستہ ہو۔ میرا جو کام ہے وہ میں کرتا رہوں گا۔ جن کا کام جہل پروری اور دانش دشمنی ہے وہ اپنے کام سے لگے رہیں گے۔ میں خوب جانتا ہوں کہ اس دنیا میں نیکی کا وجود بدی سے، خیر کا شر سے اور اجالے کا اندھیرے سے ہے۔''

اس اقتباس کو پڑھ کر پروفیسر گوپی چند نارنگ کا پورا نظریہ سامنے آجاتا ہے اور بات وہیں پہنچ جاتی ہے کہ دنیا کی ہر چیز بدلتی ہے تغیر ناگزیر ہے نہیں بدلتے تو پتھر نہیں بدلتے یا وہ لوگ جو اپنے تحفظات یا مقتدرات کے باعث ادب کے تئیں ایماندار نہیں رہتے بس یہی خاص نارنگ صاحب کا نظریہ ہے اور یہی ان کا کہنا ہے کہ دنیا کی ہر چیز بدلتی ہے رہن سہن طور طریقے زبان وغیرہ وغیرہ، ایسی کونسی چیز ہے جس میں تبدیلی نہیں آتی اور ادب میں تو تبدیلی اور بھی بے حد ضروری ہے جو آج نیا ہے کل پرانا ہو جائے گا جو الفاظ آج اردو شاعری یا اردو ادب میں رائج ہیں وہ اپنی قدر و قیمت کھو دیں گے اس کی جگہ دوسرے الفاظ آئیں گے، اگر ہم اردو شاعری پر ہی گفتگو کریں تو آج سے پچاس برس پہلے گل و بلبل، شراب، میخانہ، پیمانہ، جام، سبو، ہجر، وصال، جیسے سینکڑوں الفاظ جو کہ اردو شاعری کی جان تصور کئے جاتے تھے آج متروک ہو چکے ہیں ان کی جگہ اب نئے

الفاظ اور نئی ایجادوں نے زندگی کا رخ ہی بدل دیا اب لوگ ہجر وصال اور فراق جیسے الفاظ کے بجائے اب اس طرح کے الفاظ استعمال کرنے لگے ہیں جیسے، روم، فٹ پاتھ، بلڈنگ، ٹیلیفون، فلم۔ کہنے کا مقصد صرف اتنا ہے کہ ہر زبان میں تبدیلی ہوتی ہے۔ نئے نئے الفاظ آتے ہیں دوسری زبانوں کے خوبصورت الفاظ اگر سلیقے سے استعمال کئے جائیں تو آگے چل کر وہی الفاظ اس زبان کی ملکیت ہوجاتے ہیں جو زبان نئے لفظوں یا دوسری زبانوں کے لفظوں کے استعمال کی متحمل نہیں ہوتی اس زبان کی ترقی بھی نہیں ہو پاتی۔ سنسکرت اور فارسی زبانوں کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ دراصل بات یہ ہے کہ ہر زبان کے بڑے ادیب اور شاعر جب تک کھلے ذہن کے نہیں ہوں گے اور ان میں دوسری زبانوں کے خوبصورت الفاظ کے استعمال کا حوصلہ نہیں ہوگا وہ زبان ترقی کی راہوں سے دور رہے گی۔ زبان میں اضافے کا راز ہی یہ ہے لیکن یہ جوکھم بھرا کام رسک اٹھانے والا کام ہر کس و ناکس کا روگ نہیں ہے یہ کام زبان کا سچا خالق ہی کرسکتا ہے اور پروفیسر گوپی چند نارنگ کا نام اردو زبان کے ایسے ہی تخلیق کاروں میں ہوتا ہے جنہوں نے اردو زبان و ادب کو بہت کچھ دیا ہے برسوں کلاسیکل شاعری کا مطالعہ کرنے کے بعد اردو زبان کی درجنوں اصطلاحات وضع کرتے ہوئے لسانیات پر اتنا کچھ لکھا ہے کہ جسے پڑھنے کے لئے ایک عمر درکار ہوگی انہوں نے ہر نئی تبدیلی کا نہ صرف استقبال کیا ہے بلکہ اس کے فروغ میں ہمیشہ پیش پیش رہے ہیں۔

پروفیسر گوپی چند نارنگ ان ہستیوں میں سے ایک ہیں جنہوں نے ادب پر کبھی جمود طاری نہیں ہونے دیا اگر انہیں کبھی یہ محسوس ہوا کہ ادب کی راہیں محدود ہوتی جارہی ہیں تو اپنی زندگی اپنی عزت اپنا وقار اور ایک بڑا رسک اٹھا کر ادب کے اس جمود کو توڑنے کے لئے لوگوں کی سوچ بدلنے کے لئے ادب میں نئی تبدیلیوں کو ضروری قرار دینے کے لئے اپنی تحریروں تقریروں اور سیمیناروں سے کچھ نہ کچھ نیا ضرور کارنامہ ضرور انجام دیتے ہیں۔ مابعد جدیدیت پر سیمینار بھی ایک ایسا ہی کارنامہ ہے جس نے ادب کو

ایک نیا موڑ دیا ہے اور اسی سیمینار میں پڑھے گئے مقالوں کو کتابی شکل میں شائع کیا ہے یہاں یہ بات بھی واضح کر دینا ضروری ہے کہ پروفیسر گوپی چند نارنگ کے تمام کارناموں کو کوئی ایک لکھنے والا یکجا نہیں کر سکتا یہی وجہ ہے کہ ان کی شخصیت اور ان کے کارناموں پر الگ الگ یونیورسٹیوں کالجوں میں کام ہو رہا ہے اردو کے کئی ادبی رسائل ان پر خصوصی نمبر نکال چکے ہیں اور نکال رہے ہیں میرا یہ کام صرف ایک قاری کی حیثیت سے اردو تنقید کے حوالے سے پروفیسر گوپی چند نارنگ کی چند کتابوں کے مطالعہ کی روشنی میں ہے۔ ان میں ایک کتاب ''اردو مابعد جدیدیت پر مکالمہ'' ہے اس لئے کہ یہ ادب میں چھائے ہوئے جمود پر ایک تازیانہ ہے اور نئی تبدیلیوں کے استقبال کا نئی تبدیلیوں کے تسلیم کرنے کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ اس کتاب میں ترقی پسندی، جدیدیت اور مابعد جدیدیت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> ''یہ 1988 کا بیان ہے۔ کیا ان سات آٹھ برسوں میں کوئی اور نظریہ ادب سامنے نہیں آیا۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک نہیں کئی نظریہ ادب زیرِ بحث رہے ہیں اور ان سب کا تعلق مابعد جدیدیت کے دور سے ہے۔ جہاں تک جدیدیت کا تعلق ہے جدیدیت تو دنیا میں دوسری جنگ عظیم کے بعد یعنی 47-1946 ہی سے رو بہ زوال ہوگئی تھی لیکن ہر زبان میں رجحانات و میلانات ہوں یا تحریکیں، اس زبان کے مخصوص حالات کے پیش نظر ہی پنپتی ہیں۔ اردو میں ان تحریکوں کے ماڈل لاکھ عالمی ہوں لیکن ان کے بعض خصائص اور Timing خاص ہمارے حالات کے مطابق ہوں گے۔ سامنے کی بات ہے کہ اردو میں جدیدیت عین اس وقت شروع ہوئی جب وہ دنیا میں تقریباً ختم ہو چکی تھی۔ مزید یہ کہ دنیا میں جدیدیت روشن خیالی کا حصہ تھی اور اس میں ترقی پسندی ایک

جوہر تھا۔ اردو میں جدیدیت ترقی پسندی کی ضد کے طور پر ابھری اور مارکسزم دشمنی (بالخصوص ماسکو برانڈ مارکسزم دشمنی) اس کی اساسی پہچان تھی۔ سردست اس سے بحث نہیں کہ صحیح کیا اور غلط کیا تھا۔ ترقی پسندی کی طرح جدیدیت نے بھی بیس پچیس برس اردو کو سیراب کیا اور پھر اس کی قوت ختم ہوگئی۔ اس بات سے شاید ہی کسی کو اختلاف ہو کہ جب تک اردو میں جدیدیت کا زور تھا، کوئی نظریاتی خلا نہیں تھا، جیسے جیسے جدیدیت کمزور ہوتی گئی اور اس میں تکرار و تعمیم کی صورت پیدا ہوئی اور ذہن و شعور کو انگیز کرنے والی تازگی ختم ہوگئی نظریاتی خلاء پیدا ہوتا گیا۔ مابعد جدیدیت جو دنیا میں کئی دہائیاں پہلے شروع ہوچکی تھی اور کئی فکری کروٹیں لے چکی تھی اردو میں اسی نظریاتی خلاء میں داخل ہونا شروع ہوئی۔ ادب میں بھی زندگی کی طرح چونکہ جدلیاتی عمل جاری رہتا ہے اور نئے پرانے کی کشمکش جاری رہتی ہے۔ بالآخر نئے نظریات پرانے نظریات کو رد کرکے یا ان کی تقلید کر کے سامنے آہی جاتے ہیں۔ کبھی ان کی آمد کا اعلان زور شور سے ہوتا ہے اور ان کے موئیدین شدت اور انتہا پسندی کا اظہار کرتے ہیں۔ کبھی یہ کام نسبتاً پرسکون اور گہرے طریقے پر ہوتا ہے لیکن ہوتا ضرور ہے اس بات سے شاید ہی کسی کو اتفاق ہو کہ اردو ادب میں اس وقت نظریاتی خلا ہے یا شاعری یا فکشن کے تخلیقی رویوں میں تبدیلی نہیں آئی، یا ادبی فکر میں نئے نظریات کا خون شامل نہیں ہوا، یا ہماری شعریات میں جن باتوں پر ساٹھ کی دہائی میں اصرار تھا آج اس میں تبدیلی نہیں آئی، اگر یہ سب تبدیلیاں حقیقت میں تو پھر یہ نہیں کہہ سکتے کہ

ہماری شعریات بدل نہیں رہی اور نئے نظریات کا عمل دخل شروع نہیں ہو چکا ہے۔''

پروفیسر گوپی چند نارنگ کی اس تحریر سے یہ ثابت ہوگیا کہ ترقی پسندی کے زوال اور جدیدیت کے کمزور پڑنے سے جو خلا پیدا ہوگیا تھا اس کے لئے ضروری تھا کہ کوئی نیا نظریہ سامنے آئے لیکن وہ کیسے آئے اور کس طرح آئے یہ کسی نے نہیں سوچا نہ یہ بات کسی اور نقاد کے ذہن میں آئی کہ نئی تبدیلی کس طرح لائی جائے اور نظریاتی خلا جو پیدا ہوگیا ہے اسے کس طرح پر کیا جائے ہوسکتا ہے بہت سے نقادوں کے ذہن میں کوئی پلاننگ ہو جسے وہ عملی جامہ نہ پہنا سکے ہوں لیکن پروفیسر گوپی چند نارنگ جو ایک نقاد ہی نہیں بلکہ ایک دانشور کی حیثیت رکھتے ہیں ان کی دور اندیش نگاہوں میں یہ سارا منظر تھا اور وہ محسوس کررہے تھے کہ ادب میں اب نئی تبدیلیاں آنا اور نئی تبدیلیوں کا استعمال کرنا ضروری ہوگیا ہے اس لئے کہ ادھر نئی نسل کے فنکاروں نے اپنی بات اور اپنی شخصیت کو منوانے کی ضد سے شدت اختیار کرلی۔ خورشید اکبر نے لکھا ہے:

(اردو ادب میں ایک ذہین حساس اور باشعور نسل رفتہ رفتہ سامنے آرہی ہے جو تحقیق وتنقید اور تخلیق تینوں سطحوں پر تازہ دم اور حوصلہ مند ہے یہ نئی کھیپ ماضی کے صحت مند اقدار کی بازیافت حال کے ہمہ جہت عرفان اور مستقبل کی روشن سمت کیلئے مصروف ریاضت ہے) اس طرح کے کئی بیانات نئی نسل کے لکھنے والوں نے دینا شروع کردیئے اور جنریشن گیپ کا مسئلہ کھڑا ہوگیا ادھر دیگر نقادوں نے اس نئی نسل کو زیادہ ہی نظر انداز کیا اور سب اپنے اپنے راجندر سنگھ بیدی، سعادت حسن منٹو، قرۃ العین حیدر، اور پریم چند میں کھو گئے تو نئی نسل کی تحریروں نے شدت اختیار کرلی اور شمس الرحمٰن فاروقی جدیدیت کے بانی کی یہ تحریریں پڑھیں تو اور بھی معاملہ گمبھیر ہوگیا۔ شمس الرحمٰن فاروقی لکھتے ہیں:

''ایسا تو نہیں ہے کہ ہمیں لوگ بڈھے ہوگئے ہیں کیونکہ اس وقت ہمیں لوگ اعتراض کرتے تھے اپنے بزرگوں پر کہ صاحب آپ

لوگ بوڑھے ہوگئے ہیں اور اب آپ لوگوں کو اپنی کرسیاں ہلتی
ہوئی نظر آرہی ہیں اور ویسے بھی پرانے ہوجانے کی بناء پر آپ
کے نظریے میں وہ لچک نہیں ہے جس سے آپ ہم لوگوں کو پڑھ
سکیں۔ کیا اس طرح کا الزام یا اعتراض ہم پر بھی عائد ہوسکتا ہے
کہ اب تم بوڑھے ہوگئے۔ لہٰذا تم لوگوں میں یہ کمزوری آگئی ہے
جو تمہارے پیشرووں میں تھی کہ تم اپنے سامنے کی چیزوں کو نہیں
پڑھ سکتے۔ ہم لوگ کم از کم میں بوڑھا ہوچکا ہوں اور اس لئے مجھے
اپنے بعد والوں کی تحریریں دکھائی نہیں دے رہی ہیں جس طرح
سے کہ ہم لوگ اپنے بزرگوں سے شکایت کیا کرتے تھے۔''

اس طرح کی تحریروں نے نئی نسل کو ان کے ذہنوں کو اور بھی منتشر کر دیا ان میں ایک بوکھلاہٹ پیدا ہوگئی۔ ان تمام باتوں کو پروفیسر گوپی چند نارنگ نے محسوس کرتے ہوئے ادب میں نئی تبدیلیوں کا استقبال کرتے ہوئے نئی نسل کا ساتھ دیا اور مابعد جدیدیت جیسا ایک پلیٹ فارم دیا۔ گوپی چند نارنگ نے اردو تنقید کو ایک نئی زندگی دی ہے۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ اردو تنقید کا ایک ایسا نام ہے کہ جس کے ذہن و دل میں جہاں ایک طرف ہندوستان کی یعنی اپنے وطن کی محبت بسی ہوئی ہے وہیں دوسری طرف وہ اردو تنقید کے ایسے بے تاج بادشاہ ہیں کہ سو سال آگے کی طرف ان کا ذہن جاتا ہے ایسی ہی عظیم ہستیوں کی وجہ سے اردو ادب میں نہ صرف چہل پہل رہتی ہے بلکہ بہت کچھ نیا ادب کو دیتے ہیں۔ ادب میں ہر نئی تبدیلی کا استقبال کرتے ہیں اگر ادب میں یہ تبدیلیاں نہ ہوں تو زبان پر بھی زوال آجاتا ہے۔ بقول علامہ اقبالؔ ؎

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہے

پروفیسر گوپی چند نارنگ نے ستاروں سے آگے نہ صرف جہانوں کو تلاش کیا ہے بلکہ وہاں تک رسائی حاصل کرلی ہے ان کا کہنا ہے کہ ترقی پسند اور جدیدیت کا دور ختم

ہو چکا ہے اور آگے کے تمام راستے کھلے ہوئے ہیں اسی لئے وہ لکھتے ہیں کیا آگے کا راستہ بند ہے:

"کیا اردو میں ہم اس مقام پر پہنچ گئے ہیں جہاں آگے کا راستہ بند ہے ادب بھی زندگی کی طرح ایک سفر ہے عہد بہ عہد منزل بہ منزل جس میں حالات بدلتے ہیں ترجیحات بدلتی ہیں، رویے بدلتے ہیں، لوگ بدلتے ہیں، تقاضے بدلتے ہیں، فضا بدلتی ہے، مناظر بدلتے ہیں۔ ادب بند گلی نہیں، تبدیلی جس طرح زندگی میں ناگزیر ہے ادب میں بھی ناگزیر ہے۔ اس کو سب مانتے ہیں، اس میں کسی کو اختلاف نہیں۔ تبدیلی پچھلے پندرہ بیس سال سے ہوچکی ہے خاصی ہوچکی ہے اس وقت بھی لحظہ لحظہ ہو رہی ہے۔ صرف اردو میں نہیں تمام زبانوں میں ہو رہی ہے، تخلیقی رویے بدل چکے ہیں، سچویشن بدل چکی ہے ادب کی فضا ادب کا مزاج اور حسیت بدل چکی ہے، بدل رہی ہے آج جس طرح ادب لکھا جا رہا ہے وہ پہلے کے ادب سے مختلف ہے اردو کی نئی پیڑھی کے ادیب اور شاعر صاف صاف کہتے ہیں کہ ان کا تعلق روایتی ترقی پسندی سے ہے نہ روایتی جدیدیت سے ان دونوں کا زمانہ گزر چکا اس پر سب کا اتفاق ہے۔"

پروفیسر گوپی چند نارنگ کی تحریر کا یہ وہ اقتباس ہے جس پر ان کی پوری تنقید کی اساس قائم ہے یہی وہ نظریہ ہے یہی وہ مسئلہ ہے جسے پروفیسر گوپی چند نارنگ نے نہ صرف محسوس کیا بلکہ نئی نسل کے روبرو کھڑے ہوگئے اور انہیں اپنا مقام دلانے کے لئے ان کے مسائل کو اپنی تنقید کا موضوع بنایا یہ کوئی معمولی کارنامہ نہیں ہے کہ جب سارے نقاد اپنے اپنے گروپ اور اپنے اپنے پسندیدہ فنکاروں پر لکھنے کو اپنا مقصد بنا چکے تھے

جنہیں نئی نسل کی طرف دیکھنے نہ انہیں پڑھنے کی فرصت تھی ان پر لکھنا تو دور کی بات ہے لیکن پروفیسر گوپی چند نارنگ نے نہ صرف لکھا بلکہ ایک تحریک کی شکل میں مابعد جدیدیت کا علم لیکر کھڑے ہو گئے یہی ان کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔ یہی ان کی تنقید کا امتیازی پہلو ہے کہ انہوں نے ادب کو ہر سیاست سے دور رکھ کر کھلے ذہن سے کھلے دل سے لکھا، یہی وجہ ہے کہ جہاں ایک طرف انہوں نے لسانیات اور ساختیات پس ساختیات اور دیگر موضوعات پر سینکڑوں صفحات لکھے ہیں اور پورا زور تھیوری پر لگایا ہے خواہ وہ افسانہ ہو غزل ہو یا ادب کی کوئی دوسری صنف ہو ان کی ہر تحریر میں نہ صرف انفرادیت ہوتی ہے بلکہ مسائل ہوتے ہیں اور ان کا حل بھی ہوتا ہے ان سب تحریروں کے ساتھ ساتھ اپنی تنقید میں نئی نسل کو موضوع بنانا بہت بڑا جوکھم بھرا کام تھا جو کسی دیگر نقاد میں نہیں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آج وہ نئی نسل کے بھی سب سے پسندیدہ نقاد سب سے ہر دلعزیز اور غیر جانب دارانہ نئے فنکاروں پر اظہار خیال کرنا ان کی تنقید کا امتیازی پہلو بن گیا ہے۔

اردو ادب کی تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ جب جب اظہار پر پابندی عائد کی گئی ہے ہمیشہ اچھی تخلیق نے جنم لیا ہے اور ایسے ایسے شاہکار وجود میں آئے ہیں کہ جو ادب میں سب سے بہترین اور معیاری تصور کئے گئے ہیں ایسی اظہار کی پابندی سے نئے نئے استعارے تشبیہات اور علامتیں جنم لیتی ہیں۔ بادشاہوں اور نوابوں کے درباروں میں جو شاعری یا داستانیں لکھی جاتی رہی ہیں ان میں تشبیہات اور علامتوں کا استعمال صرف اسی لئے کیا جاتا تھا کہ بادشاہوں کی یا دیگر حکمرانوں کی ناراضگی کا خطرہ لاحق رہتا تھا اس وقت کی زیادہ تر تحریریں حکمرانوں کی خوشنودگی حاصل کرنے کے لئے وجود میں آتی تھیں لیکن پھر بھی ہر بڑا سچا فنکار اشاروں کنایوں میں طنز کرنے سے باز نہیں آتا تھا اور حکمرانوں کو سچائی کا آئینہ دکھانے کی کوشش کرتا تھا اور اس جرم کی پاداش میں کسی کو زہر دیدیا جاتا تھا کسی کو قتل کر دیا جاتا تھا۔ یہ ہمیشہ ہوتا چلا آیا ہے اور ہوتا رہے گا اور ہر سچا

فنکار سچا شاعر ادیب سچ کہنے سے باز نہیں آئے گا، پاکستان میں جب مارشل لا کا اعلان کر دیا گیا تو وہاں کے شاعروں ادیبوں نے علامتوں اور استعاروں کے ذریعہ بات کہنا شروع کر دیا۔ کہنے کا مطلب صرف یہ ہے کہ ادب کی خواہ کوئی سی بھی صنف ہو شاعری ہو افسانہ ہو ناول ہو یا ڈرامہ ہو اظہار پر پابندی کسی بھی حالت میں فنکار کو گوارا نہیں ہوتی منٹو کے افسانے ہوں یا عصمت چغتائی کا لحاف ہو ہر فنکار کو کھل کر اظہار کی آزادی جب تک حاصل نہ ہوگی تب تک وہ اچھی تخلیق نہیں کر سکتا۔ علامتوں استعاروں کا وجود صرف اسی وجہ سے ہوا۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ نے اردو ادب کی تمام اصناف سخن کا اتنا گہرا مطالعہ کیا ہے کہ ان میں ڈوب کر تنقیدی شہ پارے اردو ادب کو دیئے ہیں کہ اردو تنقید مالا مال ہوگئی۔ اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ پروفیسر نارنگ نے اردو ادب کی تمام اصناف خواہ افسانہ ہو یا غزل ہو ناول ہو یا نظم ہو انہوں نے اپنی تنقید میں اور تنقید کے تمام تر نشانات کو ہماری تہذیب کی جڑوں میں تلاش کیا ہے افسانے سے متعلق ڈاکٹر صادق اپنے ایک تنقیدی مضمون میں لکھتے ہیں:

> ''نارنگ صاحب نے جہاں جہاں اساطیر، علامات سامی و اسلامی روایات سے لے کر بودھی اور ہندوستانی دیو مالائی حکایتوں اور ان کے پس منظر میں جدید افسانے کا سراغ لگایا ہے، وہاں وہ محض قصہ گوئی کی تاریخ بیان نہیں کرتے بلکہ تاریخ سے پرے جا کر ان تہذیبی سرچشموں تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں جو صدیوں کے گردوغبار میں اٹ گئے ہیں۔ بیدی کے فن کی اساطیری جڑوں میں ان کا رخ ہندو دیو مالا کی طرف ہے جبکہ انتظار حسین چوتھے کھونٹ میں ان کے حوالوں کا دائرہ وسیع ہو کر پورے جنوب مشرقی ایشیا کو اپنی حدوں میں سمیٹ لیتا ہے۔ صحیح تو یہ ہے کہ انہیں سرسری گزر جانے کا فن ہی نہیں آتا۔ مثلاً انتظار حسین کی کہانی ''کشتی''

کا تجزیہ کرتے ہیں تو نسل انسانی کی تباہی و بربادی اور اس کی بقا کے مسئلے سے اسے جوڑ دیتے ہیں پھر سامی، انجیلی اور اسلامی روایات میں اس کے آثار تلاش کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''لگتا ہے کہ یہ روایات دو ہزار سال مسیح سے قبل سمیری Sumerian اور عبرانی قصوں سے شروع ہوئیں اور دنیا کی تہذیبوں میں پھیل گئیں Deucalion کے یونانی قصے بھی اسی سے متاثر ہوئے اور سنسکرت میں منو کی روایت بھی انہیں قصوں سے چلی ہوں گی۔ ان سب کی پشت پر غالباً وہ زبردست تاریخی سیلاب رہا ہوگا جس میں پورا Tigris Euphrates دوآبہ غرق ہوگیا ہوگا اور جس کے 1900 سالہ قبل مسیح کے قدیم آثار، میسوپٹومیہ کی کھدائی میں دریافت ہو چکے ہیں۔''

دیگر افسانوں کے تجزیوں میں بھی نارنگ صاحب کا یہی انداز ہے۔ تاریخ تہذیب، اساطیر، رسومات، اور لوک روایات، نارنگ صاحب کی خاص دلچسپی کے محور ہیں۔ انتظار حسین اور بیدی کے افسانوی فن پر جو مضامین ہیں وہ اسی لئے انتہائی معنی خیز، علم افزا ہیں اور معلومات افزا ہیں کہ ان میں نارنگ صاحب کے مطالعات کا بھی نچوڑ آ گیا ہے۔ ان مطالعات اور نتائج نے ہمیں یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ کہانی کی طرح ساری انسانیت ایک ہی سرچشمے سے خلق ہوئی ہے۔ تہذیب اپنی انتہا میں واحد ہے جس کی اکائی انسان اور صرف انسان ہے۔

گوپی چند نارنگ نے جدید افسانے پر گفتگو کرتے ہوئے بعض نئے سوالات بھی اٹھائے ہیں بعض پرانے شکوک رفع

بھی کیے ہیں اور خاص طور پر ان نقادوں پر سخت گرفت بھی کی ہے
جو جدیدیت کے ایک مخصوص تصور کے مطابق محض تجرید اور
علامت ہی کو جدید افسانے کی اصل خوبی اور انفرادیت مانتے
ہیں۔ حقیقت اور حقیقت نگاری کے نام ہی سے انہیں چڑھ ہے۔
نارنگ صاحب نے اس قسم کے مغالطے کو بھی دور کرنے کی مخلصانہ
سعی کی ہے۔ ان کے خیال کے مطابق افسانے کا نہ تو کوئی ایک
اسلوب ہے اور نہ کوئی ایک تکنیک.......... ۔ کہانی کاروں کو نہ تو
کردار سے کد ہونا چاہئے اور نہ حقیقت کے عام یا خاص مفہوم سے
''نیا افسانہ علامت، تمثیل اور کہانی کے جوہر'' میں انہوں نے اپنے
ایک پرانے سوال کو دہرایا ہے جو خود کئی سوالات کا مجموعہ ہے اور
پھر اس کا جواب بھی خود ہی فراہم کر دیا ہے۔''

نارنگ صاحب سے متعلق ڈاکٹر صادق کے اس طویل اقتباس کو پیش کرنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ اس پورے مضمون میں نارنگ صاحب کی تنقید نگاری اور ان کے مطالعات افسانے کی کھوج افسانے کی روایات اور نئے افسانے کے امکانات پر نہ صرف بھرپور روشنی پڑتی ہے بلکہ نارنگ صاحب کے ذہن تک آسانی سے رسائی ہو جاتی ہے کہ افسانے سے متعلق انہوں نے دیومالائی قصوں سے لے کر آج تک کے افسانے پر افسانے کے عروج اور زوال پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے اور افسانے کی کھوج کرتے ہوئے پوری انسانی تہذیب کو کھنگال ڈالا ہے یہی نارنگ صاحب کی تنقید کا امتیازی پہلو ہے کہ وہ غزل ہو یا افسانہ ناول ہو یا ڈرامہ مثنوی ہو یا مرثیہ وہ ادب کی ہر صنف پر گہرائی سے اس میں ڈوب کر ہندوستانی تہذیب کے سرچشموں کو کھوج نکالتے ہیں اور جو بات کرتے ہیں وہ اپنی علمی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے اس پر دلائل سے بحث کرتے ہیں۔ افسانے سے متعلق انہوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ پورے افسانوی ادب کو

پیش نظر رکھ کر اپنے گہرے اور عمیق مطالعہ کے بعد قلم اٹھایا ہے سچائی تو یہ ہے کہ وہ ہر موضوع کے ساتھ اس میں ڈوب کر اور بے حد مطالعہ کے بعد اپنی بات کا آغاز کرتے ہیں ان کے مطالعہ اور مشاہدے کا یہ عالم ہے کہ وہ ایک ایک لفظ میں معنی کا سمندر سمو دیتے ہیں اور ان کی زبان سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ سند کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے اردو افسانے سے متعلق ان کی کسی بھی تحریر کو پڑھ لیجئے اس میں ان کی انفرادیت اور ان کے مشاہدے اور مطالعہ کی جھلکیاں نمایاں نظر آتی ہیں۔ وہ نئے افسانے سے متعلق لکھتے ہیں:

''نئے افسانے نے بغاوت کی جو آگ روشن کی تھی تقریباً چوتھائی صدی کے سفر کے بعد اب وہ آگ ٹھنڈی پڑنے لگی ہے اور نیا افسانہ ایک ایسے دوراہے پر آ گیا ہے جہاں نئے سوال پیدا ہونے لگے ہیں کہ اب اس کا سفر کس سمت میں ہوگا۔ میں نے یہ بھی کہا تھا کہ نئی کہانی انحراف سے زیادہ اجتہاد اور انقطاع کے لمحوں کی پیداوار تھی۔ نئے افسانہ نگار فکر و احساس اور اظہار و اسلوب کے یکسر نئے مسائل سے دوچار تھے۔ ان کے دلوں میں ایک انجانا کرب اور نئی آگ تھی، جس کی وجہ سے نئے افسانے کا آبگینہ تندئ صہبا سے پگھلنے لگا تھا۔ اردو میں پریم چند سے لے کر منٹو اور پھر بیدی تک حقیقت نگاری میں کچھ ایسی سطحیں تھیں جن سے علامتی مفاہیم کا انکھور پھوٹ سکتا تھا۔ لیکن باقاعدہ علامتی کہانی کا آغاز 1955-60 کے لگ بھگ پاکستان میں انتظار حسین اور انور سجاد اور ہندوستان میں بلراج منیر اور سریندر پرکاش کی نسل سے ہوا۔ ان کے ساتھ ساتھ دوسرے افسانے نگار اٹھے اور دیکھتے ہی دیکھتے اردو افسانے کے زمین و آسمان بدل گئے۔ نئی کہانی کا سب سے بڑا مسئلہ حقیقت کا بدلتا ہوا تصور تھا، یعنی حقیقت صرف

وہ نہیں ہے جو دکھائی دیتی ہے بلکہ اصل حقیقت وہ ہے جو اسماء و اشکال کی دنیا سے پرے حواس سے اوجھل رہتی ہے اور جسے لفظ کو محض نشان کے طور پر استعمال کرنے سے نہیں بلکہ لفظ کو استعارے اور علامت کے طور پر استعمال کرنے سے ظاہر کیا جا سکتا ہے۔ نیز یہ کہ کہانی صرف شعوری یا منطقی رشتوں کا نام نہیں۔ اس میں لاشعور کی کارفرمائیوں کا بھی عمل دخل ہے۔ چنانچہ وقت کے منطقی رشتے اور زمان و مکان کی تعبیریں مسترد قرار پائیں اور وقت کا تصور ایک تسلسل کے طور پر در آیا۔ تخلیقی رویے کی اس بنیادی تبدیلی کے ساتھ ساتھ پچھلے دور کی سطحی رومانیت، کھوکھلی جذباتیت، اشتہاریت ، برہنہ مقصدیت اور خارجیت سب زد میں آئے اور ان پر خط تنسیخ کھینچ گیا۔ نئی کہانی نے اپنی سب سے بنیادی پہچان تصور حقیقت اور اظہار کے پیرایوں میں تبدیلی سے کرائی۔ یعنی لفظ نرے لفظ نہیں تھے بلکہ ایسے استعاروں اور علامتوں کے طور پر استعمال ہونے لگے جن کے مفاہیم کو منطقی طور پر Paraphrase کرنا ممکن نہیں۔ فرد کی فردیت اس کے معمولی پن میں اس کی uniqueness چھوٹے چھوٹے دکھ سکھ اور بنیادی صداقتیں، یعنی زندگی کی نوعیت اور ماہیت خوشی اور غم کی حقیقت ، وجود کا اختیار اور جبر، جنس کی سچائی، عرفانِ ذات کی دہشت نیز طرح طرح کے موضوعات کی رنگارنگی کہانی کی دنیا میں اپنی کیفیت دکھانے لگی کہانی کی قدر شناسی کی سطح پر بڑی تبدیلی یہ آئی کہ موضوع سے چونکہ ادب کی تشکیل نہیں ہوتی، اس لئے موضوع اور اظہاری پیکر سے مل کر جو تخلیقی وحدت وجود میں آتی

ہے وہ افسانہ ہے۔''

اس اقتباس میں نارنگ صاحب نے افسانے سے متعلق تمام پہلوؤں کا اس خوبصورتی سے احاطہ کیا ہے کہ افسانے کا پورا تاریخی سیاسی، سماجی پس منظر سامنے آ گیا ہے یعنی کہ افسانہ کہاں سے شروع ہوتا ہے اور افسانے کا بنیادی پہلو کیا ہے اور افسانہ کیسا ہونا چاہئے یہ کہ کہانی صرف شعوری یا منطقی رشتوں کا نام نہیں ہے اس میں لاشعور کی کارفرمائیوں کا بھی عمل دخل ہے اور ہونا چاہئے، نارنگ صاحب نے نئے افسانے پر اظہار خیال کرتے ہوئے اس مختصر تحریر میں ہی اچھے افسانہ کا پورا خاکہ بیان کر دیا ہے۔ ان کی تنقید میں بڑی گہرائی اور گیرائی ہوتی ہے وہ بات میں سے بات پیدا کرنے کے ہنر سے نہ صرف واقف ہیں بلکہ اپنے مطالعہ مشاہدہ کی روشنی میں جو نتیجہ اخذ کرتے ہیں وہی ان کی تنقید کا امتیازی پہلو بن جاتا ہے ان کی کسی بھی تحریر کو پڑھ لیجئے چاہے وہ افسانے سے متعلق ہو یا نظم سے متعلق ہو یا غزل مثنوی یا ساختیات سے متعلق کوئی تحریر ہو یا کہ مابعد جدیدیت سے متعلق ہو افسانے سے متعلق اس اقتباس کو پڑھ کر یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ نارنگ صاحب کی تحریروں میں کتنی انفرادیت ہوتی ہے وہ ہر موضوع پر لکھتے وقت ایک بڑے محقق ناقد بن جاتے ہیں اور تخلیق کی تہہ میں جھانک کر ایسے انفرادی پہلو تلاش کرتے ہیں کہ وہ تخلیق بھی زندۂ جاوید بن جاتی ہے۔ جدید نظم کی شعریات پر ایک نظر ڈالتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

> ''اردو میں جدید نظم کا اپنے آزادانہ فنی اور شعری وجود کو منوانا بیسویں صدی کے نصف اول کا کارنامہ تھا یہ اردو شاعری میں یکسر ایک نئی تخلیقی جہت کا کھلنا تھا جس میں نظم طباطبائی و شرر سے لے کر میراجی و راشد اور بالخصوص موخر الذکر دونوں شریک رہے تھے۔ یہ بات ایک عجوبے سے کم نہیں کہ اردو کی تاریخ میں پہلی بار یہ محسوس ہوا کہ غزل جو ہماری مرکزی صنف سخن ہے موجود تو تھی لیکن نظم

کے تخلیقی وفور سے دب کر اس کو عزت کی جگہ دینے لگی۔ بہر حال یہ سب کچھ جدیدیت کے باقاعدہ آغاز سے پہلے ہوا۔ چھٹی دہائی میں جدیدیت کے باقاعدہ آغاز کے بعد دیکھا جائے تو شعرا کی تعداد میں اگرچہ اضافہ ہوا اور نظم لکھی جاتی رہی لیکن تخلیقی وفور میں کمی آتی گئی اور نظم کی معنیاتی کائنات روز بروز سکڑنے لگی۔ اس بات سے شاید ہی کسی کو اختلاف ہو کہ بعد کے دور میں شعراء تو بیسیوں ہیں لیکن معنیاتی کائنات یا تخلیقی وفور میں پہلی سی بات نہیں۔''

اس اقتباس میں نارنگ صاحب نے جدید اردو نظم پر روشنی ڈالتے ہوئے اردو نظم کے آغاز سے لے کر نظم کے سنہری دور اور اہم نظم نگاروں کا جائزہ لیا ہے اور اختر الایمان، ن م راشد، خلیل الرحمٰن اعظمی، جوشؔ، فیض احمد فیضؔ اور دیگر ترقی پسند نظم نگاروں کے علاوہ جدید اردو نظم نگاروں پر بھی بھرپور گفتگو کی ہے اور اپنے اصل موضوع پر جس پر وہ پچھلے چند سالوں سے زیادہ ہی لکھ رہے ہیں۔ یعنی ادبی تھیوری سے متعلق وہ اپنی تحریروں اور تقریروں میں بھی اظہار کرتے رہے ہیں یعنی مابعد جدیدیت اور ادبی تھیوری ان کا خاص موضوع رہا ہے اسی مضمون میں وہ آگے چل کر لکھتے ہیں:

''اہل نظر جانتے ہیں کہ ادبی تھیوری کی نئی بحثوں نے ادبی متن کے حوالے سے آگہی کے کتنے ہی در وا کر دیئے ہیں اور کتنے ہی قدیمی مسائل پر از سرِ نو توجہ مرکوز ہوئی ہے مثلاً ادب لاکھ انفرادی ذہن وفکر کا کرشمہ سہی کوئی ادبی متن، متن محض نہیں ہے۔ ہر ادبی متن زبان ہی سے متشکل ہوتا ہے اور زبان سب سے بڑا سماجی مظہر ہے جو معاشرہ ہی میں قائم ہوتی ہے اور معاشرے کی مخصوص ثقافت کی رو سے ہی معنی کی حامل بنتی ہے یعنی ادب میں معنی آفرینی یا جمالیاتی اثر

کا کرشمہ یہ سب اولاً ثقافت ہی کی رو سے ممکن ہوتا ہے۔ دوسرے یہ
کہ کوئی ادبی متن، متنِ محض نہیں ہوتا۔ ہر ادبی متن کسی نہ کسی طرح
کی بین المتونیت Intertextuality کا حامل ہوتا ہے اور یہ
بین المتونیت خلا میں نہیں، ثقافت اور تاریخ کے محور پر عمل پیرا ہوتی
ہے۔ تیسرے یہ کہ ادب میں کوئی موقف معصوم Neutral نہیں
ہے یعنی فقط ادبی بیانات یا فیصلے ہی اقداری نہیں ہوتے، ہر متن
میں جو نظریہ حیات بلاواسطہ یا بالواسطہ طور پر مضمر ہوتا ہے مصنف کو
اس کا احساس ہو یا نہ ہو، وہ اقداری ہی ہوتا ہے اور ہر اقداری ترجیح
کسی نہ کسی طور پر آئیڈیولوجیکل نوعیت کی حامل ہوتی ہے۔ گویا معنی تو
آئیڈیولوجیکل تشکیل ہوتا ہی ہے اور تو اور آئیڈیولوجی خود زبان کے
اندر کھدی ہوئی موجود ہے۔ چوتھے یہ کہ متن میں معنی بالقوۃ موجود
ہیں انہیں بالفعل موجود قاری بناتا ہے اور قرأت کا تغافل تمام تر
ثقافت اور تاریخ کے محور پر واقع ہوتا ہے۔''

جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ پروفیسر نارنگ نے پچھلے کئی سالوں سے تھیوری سے متعلق بہت کچھ لکھا ہے اور مسلسل اپنی تحریر میں تھیوری کی اہمیت اور افادیت پر زور دیا ہے۔ چاہے وہ کسی بھی موضوع پر لکھتے ہوں ساختیات ہو یا پس ساختیات غزل ہو یا نظم ہو مثنوی ہو یا افسانہ ہو ترقی پسندی ہو یا جدیدیت یا کہ مابعد جدیدیت اس مضمون میں بھی انہوں نے مابعد جدیدیت کے حوالے سے تھیوری کی اہمیت اور افادیت پر روشنی ڈالی ہے۔ ادب کی دنیا میں ہوتا یہ ہے کہ کوئی معمولی آدمی یا چھوٹا موٹا تخلیق کار کسی اہم پہلو یا اہم موضوع پر کوئی ایک آدھ جملہ انوکھا یا منفرد کہہ بھی دے تو اس کی بات خلاؤں میں گم ہو جاتی ہے۔ اس لئے کہ اس کا مطالعہ مشاہدہ یا اس کی شخصیت ہی بڑی نہیں ہوتی تو اس کی بات میں بھی وزن پیدا نہیں ہوتا اور ایسے لوگ چیختے چلاتے رہ جاتے ہیں نہ وہ

ادب میں کوئی تبدیلی لا سکتے ہیں نہ سوئے ہوئے ماحول کو جگا سکتے ہیں نہ ان کی تحریروں نہ ان کے بیان کو قابل اعتنا سمجھا جا سکتا ہے اس لئے ان کی آواز گھٹ کر رہ جاتی ہے لیکن کوئی معتبر نامور اور بڑی شخصیت کوئی ایک جملہ یا ایک بیان بھی دیدے تو ادب کی دنیا میں کہرام مچ جاتا ہے ایسی ہی عظیم اور معتبر ہستی کا نام پروفیسر گوپی چند نارنگ ہے جن کے ایک جملے ایک بیان سے ہی ادب میں نہ صرف ہلچل ہو جاتی ہے بلکہ ادب میں چھائے ہوئے جمود پر ایک تازیانہ پڑتا ہے اور برسوں سے چھائے ہوئے جمود میں ایسی خوش آئند تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں کہ نہ صرف پورا ادب متاثر ہوتا ہے بلکہ ہر تخلیق کار اپنے ذہن میں ان نئی تبدیلیوں کا استقبال کرنے کے لئے، ان کا استعمال کرنے کے لئے مجبور ہو جاتا ہے۔ نارنگ صاحب کی تنقید کا یہی کمال ہے کہ ان کا لکھا ہوا ایک ایک جملہ ادب کو متاثر کرتا ہے ادیب کو متاثر کرتا ہے اور یہ سب کچھ اس لئے ہوتا ہے کہ پروفیسر گوپی چند نارنگ نے اپنی پوری زندگی ادب کیلئے وقف کر رکھی ہے۔ ادب ان کا اوڑھنا بچھونا رہا ہے وہ ادب پڑھتے ہیں ادب سوچتے ہیں ادب لکھتے ہیں اور اپنی پوری زندگی کے مطالعے مشاہدے اور تجربات کی روشنی میں تحریر اور تقریر میں نیا کچھ پیش کرنے، ادب کو نیا کچھ دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ کیونکہ بقول ان کے ادب پنپتا ہے اجتہاد سے اختلاف سے تب کہیں جا کر ادب میں نئی تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں اور یہی نئی تبدیلیاں ادب کی فضا ہموار کرتی ہیں ادب کو نیا وقار بخشتی ہیں اور ادب کے بقا کی ضامن ہوتی ہیں اور ان نئی تبدیلیوں کا استقبال کرنے ان کو فروغ دینے میں پروفیسر گوپی چند نارنگ ایک زندہ مثال ہیں۔ مابعد جدیدیت اردو ادب میں اس نئی تبدیلی کا جیتا جاگتا ثبوت ہے جس پر نارنگ صاحب مسلسل لکھ رہے ہیں اور یہ سب کچھ ادب میں نئی تبدیلیوں کے لئے کیا جا رہا ہے یعنی جدیدیت کے بعد جن تخلیق کاروں نے اپنے فن اور اپنی تخلیق میں اظہار کی آزادی کو اپنا وسیلہ بنایا ہے یہ سب کچھ ایسے ہی تخلیق کاروں کے لئے کیا جا رہا ہے۔ پروفیسر نارنگ نے اس بات پر ہی زور دیا ہے کہ ہر تخلیق کار کو اپنے فن پر اعتماد ہونا

چاہئے اسے اپنی پسند سے لکھنا چاہئے کسی ترقی پسند تحریک یا جدیدیت کے سائے میں اپنے تخلیقی فن کو ضائع نہیں کرنا چاہئے۔ اس سلسلہ میں وہ کئی بار اپنے کئی مضامین میں بہت کچھ لکھ چکے ہیں اور اپنے تنقیدی نظریات واضح طور پر بیان کر چکے ہیں۔ انہوں نے اس کی کئی مثالیں پیش کی ہیں کہ ترقی پسندوں نے ایک موقف اور ایک نظریہ کو ادب میں رائج کرنے کی کوشش کی جدیدیت نے ادب سے اس کی روح کو چھین لیا یعنی شاعری سے تازگی چھین لی اور کہانی سے کہانی پن۔ یہی وجہ ہے کہ مابعد جدیدیت یعنی جدیدیت کے بعد جو نسل ابھر کر آئی اس نے ان ساری تحریکوں اور سارے نظریات کو بالائے طاق رکھ کر آزاد فضا میں سانس لی اور آزادئ اظہار کو اپنایا اور ہمارے اردو کے دانشور معتبر نقاد پروفیسر گوپی چند نارنگ نے مابعد جدیدیت کی باگ ڈور سنبھال لی وہ ایک جگہ لکھتے ہیں:

> ''غور فرمائیں جس طرح فن کار اپنے ذہن سے لکھتا ہے اپنی پسند و ناپسند سے لکھتا ہے۔ زبان کے تئیں اس کا رویہ انسانی معاملات کے تئیں اس کا رویہ ایک آزادانہ رویہ ہوتا ہے۔ ہر موضوع پر وہ آزادانہ اپنے ذہن و شعور سے لکھتا ہے اسی طرح نقاد بھی تو اپنی اقداری و آئیڈولوجیکل پسند و ناپسند میں آزاد ہے۔ وہ بھی تو اپنے ذہن سے لکھتا ہے اپنی اقداری ترجیحات سے لکھتا ہے اور اس میں وہ بھی آزاد ہے یوں آپ دیکھیں کہ آپ کے سامنے ایک متن ہے یا غزل ہے، یا نظم ہے تو سب سے پہلے دیکھنے کے عمل ہی پر غور کریں تو یا تو آپ سامنے سے دیکھیں گے یا دائیں زاویے سے دیکھیں گے یا بائیں زاویے سے دیکھیں گے، یا اوپر سے (تاریخ و تناظر کے حوالے سے) دیکھیں گے، یا بہت قریب سے دیکھیں گے Close reading کریں گے یا Contextual historical reading کریں گے کسی نہ کسی رویے یا

طریق عمل کو تو اپنانا ہوگا۔ تنقید لکھنے والا خلاء میں تو نہیں لکھتا۔ میں چاہتا ہوں آپ اس پر بھی غور کریں کہ جس طرح فنکار، ادیب یا شاعر کا ذہن بنتا ہے وہ تو آپ کو خوب معلوم ہے لیکن نقاد کا ذہن کس طرح بنتا ہے وہ اپنی تربیت کس طرح کرتا ہے اس کو بھی اگر نظر میں رکھیں تو آپ کو یہ بات صاف صاف نظر آئے گی کہ تنقید کبھی سو فیصد غیر جانبدار نہیں ہو سکتی، معصوم یا بے لوث ہو ہی نہیں سکتی۔ ہاں آپ یہ توقع کر سکتے ہیں کہ وہ فن پارے کے ساتھ زیادہ سے زیادہ انصاف کرے یعنی متن کو پڑھے۔ متن کا تجزیہ کرے اور تجزیے کا، مطالعے کا، عملی تنقید کا حق ادا کرے، روایت کی روشنی میں، تاریخ، عصر، شعریات کی روشنی میں، لیکن نقاد کی اپنی اقداری نظریاتی پسند و ناپسند تو ہوگی۔ تنقید لکھنے والے کا رویہ تو اس کا اپنا رویہ ہوگا وہ آپ کے ذہنی رویے سے تو نہیں لکھے گا۔ جیسے آپ اس کے ذہنی غلام نہیں ہیں، نقاد بھی آپ کا ذہنی غلام نہیں ہے۔ یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے۔''

اس اقتباس میں نارنگ صاحب نے اپنے تنقیدی نظریات کو واضح طور پر بیان کر دیا ہے کہ جس طرح ہر تخلیق کار کھلی فضا میں سانس لینا چاہتا ہے کھل کر لکھنا چاہتا ہے اپنے من پسند موضوع پر لکھنا زیادہ پسند کرتا ہے اسی طرح ہر نقاد بھی اپنے نظریات رکھتا ہے اور وہ تمام اچھی چیزوں کو بغور پڑھنے کے بعد اس پر اظہار خیال کرتا ہے یہ سارا انحصار تخلیق کے معیار پر ہوتا ہے کہ جس طرح ایک تخلیق کار خلاء میں نہیں لکھ سکتا اسی طرح ایک نقاد بھی خلا میں نہیں لکھتا اس کا بھی ایک طریقہ عمل ہوتا ہے۔ یہاں ہمیں پروفیسر گوپی چند نارنگ کی تنقید نگاری کا اسی نوعیت سے جائزہ لینا ہے کہ ان کی تنقید کا طریقہ عمل کونسا ہے۔ وہ فن کار کے ذہن تک رسائی حاصل کرنے کے لئے فن کی کن خوبیوں کو دیکھتے ہیں اور انہیں

اہمیت دیتے ہیں جس طرح دیگر نقادوں کا ذہن بنتا ہے پروفیسر نارنگ کا ان کی تنقید کا کیا طریقہ عمل ہے وہ تخلیق کے کن پہلوؤں پر زیادہ زور دیتے ہیں اب تک جو تحریریں جو مضامین جو کتابیں ان کی سامنے آئی ہیں خاص طور پر وہ چار پانچ کتابیں جو ان کی چالیس سالہ محنت اور ان کے مطالعہ اور مشاہدے کا نتیجہ ہیں۔ میں اپنا یہ مضمون انہی چار پانچ کتابوں کی روشنی میں تحریر کررہا ہوں کیونکہ ان چار پانچ کتابوں میں پروفیسر گوپی چند نارنگ نے پوری انسانی تہذیب کو کھنگال ڈالا ہے۔ وہ کتابیں ہیں اردو مثنویاں، اردو غزل اور ہندوستانی ذہن وتہذیب، ہندوستان کی تحریک آزادی اور اردو شاعری، جدیدیت کے بعد، ترقی پسندی جدیدیت مابعد جدیدیت، یہی وہ کتابیں ہیں جو اردو ادب میں ہنگامہ کئے ہوئے ہیں یوں تو پروفیسر گوپی چند نارنگ نے اپنی زندگی کا کوئی لمحہ ضائع نہیں کیا تمام عمر ان کا لکھنا پڑھنا زندگی کا مقصد رہا ہے لیکن ان کتابوں کو پڑھ کر جو کے ایک ساتھ تھوڑے تھوڑے وقفہ سے شائع ہوئی ہیں یہ ان کی تمام عمر کا بکھرا ہوا وہ سرمایہ ہے جو اردو ادب کے لئے ایک قیمتی حیثیت رکھتا ہے ایک ساتھ اتنی ضخیم ضخیم کتابیں وہ بھی ایسے موضوعات پر کہ جن پر لکھنے کے لئے حوصلہ چاہئے علم چاہئے ہمت چاہئے لیکن نارنگ صاحب نے چند سالوں میں ہی یہ کارنامہ انجام دے کر ادبی دنیا میں ایک ایسی دھاک قائم کردی ہے کہ وہ ہر محفل ہر ادبی رسالے اخبار سیمینار میں موضوع بحث بن گئے ہیں۔ ان ہی کتابوں کی روشنی میں میں اپنے اس مضمون کی تکمیل کررہا ہوں ان ساری کتابوں میں پروفیسر نارنگ کا جو بنیادی نظریہ ہے جو سب سے بڑی اہم خصوصیت ہے وہ یہ کہ انہوں نے اپنی تمام تر تحریروں میں ہندوستانی تہذیب کو پیش نظر رکھا ہے۔ غزل کے حوالے سے مثنوی کے حوالے سے یا اردو افسانوں یا فکشن سے متعلق کوئی تحریر ہو انہوں نے اپنی تنقید کی بنیاد ہندوستانی تہذیب پر رکھی ہے یہاں ان کی دیگر تنقیدی تحریروں پر ایک نظر ڈالتے ہوئے جائزہ لیتے ہیں۔ جیسے مثلاً جدید نظم کی شعریات پر ایک نظر میں جو کچھ لکھا ہے اور جن بنیادی پہلوؤں پر انہوں نے روشنی ڈالی ہے اس پر پچھلے صفحات میں ذکر کیا جا چکا ہے اب

تنقید کی بدلتی ترجیحات پر ایک اقتباس پیش کیا جاتا ہے۔

''شروع میں میں نے عرض کیا تھا کہ ادب اور تنقید میں کوئی پوزیشن معصوم یا بے لوث یعنی غیر جانبدار نہیں ہوتی۔ نظریاتی اور اقداری ترجیحات کے بغیر تنقید ممکن ہی نہیں اس بحث میں آپ نے دیکھا کہ تمام تبدیلیاں جو آج تک ہوتی رہی ہیں وہ نظریاتی اور اقداری ہیں اور آج بھی جو تبدیلیاں ہو رہی ہیں وہ نظریاتی اور اقداری ہیں۔ اپنی اپنی تربیت و ترجیح کی وجہ سے پسند و ناپسند کی وجہ سے Ideology کی وجہ سے نقاد کی ذہنی نہج کی وجہ سے، شعریات کے مطالعات کی وجہ سے ہر نقاد اپنی اپنی توفیق کے مطابق کوئی نہ کوئی پوزیشن یعنی موقف ضرور اختیار کرتا ہے۔ اور یہ پوزیشن ہرگز ہرگز بے لوث نہیں ہوتی بلکہ ہمیشہ نظریاتی اور اقداری ہوتی ہے یہ سب واضح ہو جانے کے بعد بھی اگر کوئی کہتا ہے کہ جدیدیت منہدم نہیں ہو چکی اور رویے بدل نہیں گئے تو یا تو وہ ضدی ہے یا وہ عملاً غلط بیانی کر رہا ہے کیونکہ اندر سے جانتا وہ بھی ہے کہ جو عرض کیا جا رہا ہے وہ غلط نہیں ہے۔''

اس اقتباس میں نارنگ صاحب نے ادب اور تنقید پر گفتگو کرتے ہوئے اس بات پر زور دیا ہے کہ ادب کی خواہ کوئی سی صفت ہو اس میں تبدیلی ناگزیر ہے زبان بدلتی ہے لہجہ بدلتا ہے حالات بدلتے ہیں نظریات بدلتے ہیں۔ ظاہر ہے تنقید میں یا تنقیدی نظریات میں بھی تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں ان تبدیلیوں کو ہر باشعور شاعر ادیب نقاد نہ صرف قبول کرتا ہے بلکہ اس میں پیش پیش رہتا ہے بات صرف اتنی ہے کہ شاعر ہو یا ادیب ہو یا کہ وہ نقاد ہو اس میں تنقیدی شعور کا ہونا لازمی ہے جن ادیبوں شاعروں نقادوں میں شعور کی کمی ہوتی ہے وہ لکیر کے فقیر بنے رہنے پر فخر کرتے ہیں نہ وہ اچھے

ادب کی پرکھ رکھتے ہیں نہ اچھا ادب تخلیق کر سکتے ہیں اور اپنی تمام زندگی صرف کرنے کے بعد یہ رونا رونے لگتے ہیں کہ ہمارے ساتھ ناانصافی ہوئی ہے ہماری صلاحیتوں کو تسلیم نہیں کیا گیا جبکہ صلاحیت کیا ہوتی ہے یہ انہیں خبر ہی نہیں ہوتی بس ہلکی پھلکی غزل کہہ لینا یا عام فہم عام موضوع پر افسانہ لکھ لینا اور زیادہ ہوا تو اپنی کتاب چھپوا کر فری تقسیم کر دینا نہ انہیں تبصروں سے مطلب نہ انہیں یہ شعور کہ کتاب کن ہاتھوں میں جانا چاہئے جب تک ان تمام باتوں کا شعور کسی شاعر ادیب یا نقاد میں نہ ہوگا وہ اپنی منزل تک نہیں پہنچ سکتا اور پھر نقاد پر تو یہ ذمہ داری بہت عائد ہوتی ہے اسے تو ہر حال میں ادب سے باخبر رہنا ضروری ہوتا ہے ورنہ اس کی تنقید کی اہمیت نہ اس کی کسی دیگر تحریر کی اہمیت ہوتی ہے بلاشبہ پروفیسر گوپی چند نارنگ ایک دانشور اور اردو ادب یا انگریزی، ہندی، فارسی کے ادب سے باخبر رہتے ہیں بلکہ ان کی نظر اتنی گہری ہوتی ہے کہ کمزور سے کمزور لکھنے والے کی اچھی تحریروں پر بھی وہ نظر رکھتے ہیں ایک اچھے بڑے نقاد کی جتنی بھی خصوصیات ہوتی ہیں وہ پروفیسر گوپی چند نارنگ میں یکجا ہوگئی ہیں اس بات کا اندازہ ان کی ہر ادبی تحریر سے لگایا جاسکتا ہے۔ یہاں ان کے ایک تنقیدی مضمون کا ایک اقتباس پیش کیا جاتا ہے جو غزل سے متعلق ہے۔

> "بظاہر غزل اور فلسفے کا ربط عجیب سا معلوم ہوتا ہے۔ غزل خالص جمالیاتی شاعری ہے۔ جو جذبے اور وجدان کے پروں سے اڑتی ہے۔ یہ بیان ہے وارداتوں اور حسن وعشق کی گھاتوں کا۔ عشق اور عقل دو متضاد قوتیں ہیں۔ چنانچہ عشقیہ شاعری میں بظاہر فلسفے کی باتوں کے لئے گنجائش نہ ہونا چاہئے لیکن اصلیت اس کے برعکس ہے۔ وہ اس لئے کہ غزل کا شاعر اکثر شعری منطق کو بروئے کار لاتا ہے اور کسی نہ کسی طرح اپنے احساسات کو ان معقولات کے تحت لانا چاہتا ہے جن کا اثر اس نے

مذہب اور تہذیب سے قبول کیا ہے۔ دوسرے یہ کہ غزل کی زبان
رمز و اشارہ ہے اور وجدانی و روحانی مسائل چونکہ رمز و اشارہ کے
سوائے کسی دوسری زبان میں ادا ہو ہی نہیں سکتے، اس لئے غزل
میں حیات اور کائنات کے بنیادی مسائل پر غور کرنے کی روایت
شروع سے ملتی ہے۔ رہی یہ بات کہ اردو غزل ہندوستانی فکر و فلسفے
سے کہاں تک متاثر ہے تو اسے وہ لوگ اہمیت نہیں دیں گے جو
ادب کا مطالعہ اس کے فکری سرچشموں سے ہٹ کر کرتے ہیں یا جو
ادب کے تہذیبی محرکات کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے۔ وہ کہیں گے
کہ اردو میں غزل فارسی سے آئی اور نہ صرف ساخت اور ہیئتی
ڈھانچہ بلکہ موضوعات بھی وہیں سے آئے۔ لیکن وہ یہ بھول جاتے
ہیں کہ اردو زبان ہندوؤں اور مسلمانوں کے اشتراک سے وجود
میں آئی اور اس کی پشت پر جو تصور ہے وہ ملی جلی تہذیب کا ہے۔
خود اردو زبان اسی گنگا جمنی اشتراک کی نشانی ہے اور جب لسانی
ساخت ہی اشتراک و اختلاط پر مبنی ہے تو فکریات میں یہ اثر کیونکر
نہ آئے گا اردو کی دوسری اصناف کی طرح مشترک تہذیب کا اثر
غزل نے بھی قبول کیا ہے۔''

پروفیسر گوپی چند نارنگ کا یہ اقتباس ان کے مضمون ہندوستانی فکر و فلسفہ اور اردو غزل سے لیا گیا ہے۔ اس مضمون میں نارنگ صاحب نے غزل اور فکر و فلسفہ پر گفتگو کرتے ہوئے غزل کی ساری خصوصیات بھی بیان کردی ہیں اور یہ بھی بتا دیا ہے کہ غزل اشاروں اور کنایوں کی زبان ہے جس میں وجدانی روحانی کیفیات کے علاوہ زندگی کے تمام مسائل تو ہوتے ہی ہیں ساتھ ساتھ فکر و فلسفے سے بھی غزل کا دامن خالی نہیں رہتا لیکن زیادہ تر شاعر عشق محبت کے جذبات کو ہی شاعری سمجھتے ہیں اور اس بات پر زیادہ

زور دیتے ہیں کہ غزل تو فارسی زبان سے یہاں سے آئی ہے جو اس کے موضوعات رہے ہیں وہی غزل میں رہنا چاہئے یہاں پروفیسر گوپی چند نارنگ نے ایک بہت اچھی بات کہی ہے کہ اکثر لوگ یہ بھول جاتے ہیں کہ اردو زبان یہاں ہندوؤں اور مسلمانوں کے اشتراک سے وجود میں آئی ہے اور اس کی پشت پر جو تصور ہے وہ ملی جلی تہذیب کا ہے۔ خود اردو زبان اسی گنگا جمنی اشتراک کی نشانی ہے اس مضمون میں یہی بات سب سے اہم ہے بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ پروفیسر گوپی چند نارنگ نے اپنے تنقیدی نظریات کو بتاتے ہوئے ہندوستانی تہذیب کو تلاش کیا ہے یہ نارنگ صاحب کی تنقید کا ایک ایسا امتیازی پہلو ہے کہ جس پر اتنا کچھ لکھا جا سکتا ہے کہ باقاعدہ ایک پی ایچ ڈی کا مقالہ ہو جائے بلکہ ہونا چاہئے اس لئے کہ ہندوستان کی تہذیب کے سرچشموں میں اردو تنقید کی بنیاد کو تلاش کرنے کا بیڑا صرف گوپی چند نارنگ نے ہی اٹھایا ہے حالانکہ تنقید کی زیادہ تر اصطلاحیں مغربی ادب سے آئی ہیں اور زیادہ تر نقادوں نے انگریزی کے دم پر اپنا رعب ڈالنا ایک فیشن بنالیا ہے اور بیچارے اردو والوں کا یہ حال ہے کہ عام قاری تو دور کی بات ہے بڑے بڑے شاعروں کو بھی یہ پتہ نہیں ہے کہ تنقید کیا ہوتی کیا ہونی چاہئے کیا کچھ لکھا گیا ہے اور کیا کچھ لکھا جا رہا ہے لیکن پروفیسر گوپی چند نارنگ ایک ایسے دانشور نقاد ہیں کہ جو دنیائے ادب کی نہ صرف معلومات رکھتے ہیں بلکہ ہر ادب کی اہم تحریروں کو پڑھنے کے بعد جو نتیجہ اخذ کرتے ہیں وہ ان کی تنقید کا بنیادی موضوع ہوتا ہے۔ کبھی غزل کے حوالے سے کبھی اردو مثنوی کے حوالے سے کبھی اردو مرثیوں کے حوالے سے تو کبھی اردو افسانے کے حوالے سے وہ ہر مضمون میں اپنی ہر تنقید میں انہی بنیادی پہلوؤں کو تلاش کرتے ہیں جو کہ ہندوستانی تہذیب سے جڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ یہاں اوپر غزل کے حوالے سے جو گفتگو کی ہے اس میں انہوں نے یہی پہلو تلاش کیا ہے۔ اب ایک اور تنقیدی مضمون دیکھئے جس کا عنوان ہے ''زبان کے ساتھ کبیر کا جادوئی برتاؤ'' اس میں وہ تلسی کبیر اور دیگر سنتھوں پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''کبیر کے کلام کی اس خوبی کے بارے میں حیران کن سوال یہی ہے کہ کیا ایسے اجزا کو کبیر نے اپنے زمانے کی رائج بولیوں یا زبان سے لیا اور اپنی شاعری کی جادوئی تاثیر سے انہیں رائج کر دیا، یا یہ کہ کبیر سے پہلے تو زبان انگھڑ اور خام تھی، یہ کبیر کی تخلیقیت کا اعجاز ہے کہ کبیر کے سوزِ دروں سے تپ کر خام زبان کندن بن گئی اور اس کا معمولی پن غیر معمولی پن میں یا اس کی سادگی پرکاری میں بدل گئی اور وہی انگھڑ اور خام زبان محاورے اور روزمرہ میں رواں ہو کر ضرب الامثال کی طرح دمکنے لگی۔ دیکھا جائے تو کبیر کی شاعری اس مفروضے کو توڑتی ہے کہ شاعری زبان سے ہے، زبان شاعری سے نہیں۔ کبیر سے پہلے یہ انگھڑ ملواں زبان یا کھڑی بولی شاعری کی زبان کہاں تھی؟ کبیر نے اسے اپنی مسیحا نفسی سے شعری درجے پر فائز کر دیا، کیا یہ حیران کن Paradox نہیں کہ ''کچی'' زبان میں ''پکا'' یا بڑا شاعر پیدا ہو سکتا ہے؟ کیا زبان شاعری کو خلق کرتی ہے یا شاعری زبان کو خلق کرتی ہے؟ یعنی زبان مقدم ہے یا شاعری؟ یا یہ کہ زبان ہی تو شاعری ہے، زبان نہیں تو شاعری نہیں؟ کبیر کی شاعری کا بڑا کمال یہی ہے کہ وہ شعری زبان ان سے پہلے سے چلے آرہے تمام مفروضوں کو القط کرتی ہے اور نہ صرف نئے امثالی اظہارات کو وضع کرتی ہے بلکہ انہیں کھڑی بولی کی Archeology کا ہمیشہ رہنے والا، جیتا جاگتا حصہ بھی بنا دیتی ہے، یہ کبیر کے تخلیقی ذہن کا کرشمہ نہیں ہے تو کیا ہے کہ اس نے اظہار کے ان گنت پیرایوں کو زبان میں نقش کر دیا اور ایک خام اور ناپختہ زبان کو اپنی دلسوزی اور جادو بیانی سے لاکھوں

کروڑوں لوگوں کے دلوں کی دھڑکن بنا کے عوامی چلن کی ایسی زبان بنا دیا جو صدیوں سے زندہ ہے اور آج ہندوستان تو کیا پورے برصغیر کی عوامی زندگی کا کوئی تصور اس زبان کے بغیر مکمل نہیں۔''

اول تو کبیر کا نام ہی ہندوستانی تہذیب کا دوسرا نام ہے یعنی کبیر کا نام آتے ہی پورا ہندوستانی کلچر سامنے آجاتا ہے یہاں رائج بولیاں محاورے، اور روحانی کیفیت سے قاری کبیر کا نام سن کر سرشار ہو جاتا ہے۔ دوسرے نارنگ صاحب نے اس مضمون میں کبیر کی شاعری کا حوالہ دیتے ہوئے یہ بات واضح کردی ہے کہ کبیر کا جادوئی اثر اتنا گہرا ہے کہ آنے والے ایک پورے دور کو کبیر نے متاثر کیا ہے اس مضمون میں نارنگ صاحب نے کبیر کی تخلیقیت ان کا سوزِ دروں ان کی سادگی بیان کرتے ہوئے اس بات پر زور دیا ہے کہ کبیر عوام کے دلوں کی دھڑکن صرف اس لئے بن گئے کہ وہ ہندوستانی تہذیب اور یہاں کی مٹی کی سگند سے اس طرح رچے بسے تھے کہ ان کی شاعری کی شاخیں یہاں کی جڑوں سے اگتی تھیں وہ شاعری میں رائج ان تمام الفاظ کو ترک کر کے اپنے درد وغم اور دل سوزی کی باتیں اپنی زبان میں کرتے تھے انھوں نے شاعری کو ہندوستانی تہذیب سے جوڑ کر صدیوں تک کے لئے امر کر دیا یہاں کہنے کا مطلب صرف یہ ہے کہ گوپی چند نارنگ کی تنقید کا سب سے بڑا کمال بھی یہی ہے کہ جس طرح ہر بڑا شاعر ادیب اپنے وطن کی مٹی کی خوشبو میں معطر ہو کر جو فن پارہ پیش کرتا ہے وہی تخلیق عالمی ادب کا قیمتی سرمایہ بن جاتی ہے یہی پروفیسر گوپی چند نارنگ کی تنقید کا کمال ہے کہ انھوں نے اپنی تنقید کو بھی تخلیق کا درجہ دے دیا۔ انیسؔ کی معجز بیانی تہذیبی جہات میں وہ ایک جگہ لکھتے ہیں:

''انیسؔ کی کردار نگاری کی اس تہذیبی جہت سے ہے جسے بعض ناقدین بالعموم مرثیہ کے کرداروں کو اودھ کی معاشرت کے قالب

میں پیش کرنا اور ان کا غیر حقیقت پسندانہ ہونا کہتے ہیں۔ اور راقم الحروف جسے زبان کے تمام تخلیقی امکانات کا بروئے کار لانا اور اعلیٰ پائے کی فنکاری کی ناگزیریت قرار دیتا ہے۔ تعجب ہے کہ یہ بات کسی نے نہیں سوچی کہ بڑے سے بڑا فنکار بھی زبان کے استعمال میں اتنا آزاد نہیں ہوتا جتنا سمجھا جاتا ہے کبھی کبھی وہ زبان کو نئی گرامر ضرور دیتا ہے جس کا مطلب ہے زبان کے کسی سوئے ہوئے حصے کو جگانا، لیکن زبان کا خزانہ اس کا بھی وہی ہوتا ہے جو زبان بولنے والے سب کا یعنی اہل زبان کا ہوتا ہے زبان کا خزانہ ہمیشہ دیا ہوا ہوتا ہے always already given اسی پرانے خزانے میں سے فنکار کی تخلیقیت نئی نئی شکلیں خلق کرتی ہے جو جادو جگاتی ہیں لیکن یاد رہے کہ کلچر زبان میں کھدا ہوا ہے، زبان ایک نظام نشانات Sign system ہے جس کا اپنا جبر ہے جس سے صرف نظر نہیں کرسکتا۔ انیسؔ کے معترضین نے اردو Sign system کی نوعیت و ماہیئت پر کبھی غور ہی نہیں کیا ورنہ اعتراض کی گنجائش ہی نہ تھی۔ بڑا فنکار زبان کے زیادہ سے زیادہ تخلیقی امکانات کو بروئے کار لانا چاہے گا تو اس زبان کے Signs اس کی ترکیبیں اس کے روزمرہ اس کے محاورے، اس کے آداب و اطوار، اس کے انداز تخاطب، اس کی دعائیں، نشست و برخاست، رسوم و رواج غرض جو بھی زبان کے Sign system کا حصہ ہیں، لامحالہ ان سب کو ہی بروئے کار لائے گا۔ گویا مسئلہ ''بولے وہ ہاتھ جوڑ کے عباس نامور''، یا ''بہنوں کو نیگ لینے کی حسرت ہی رہ گئی'' یا ''صندل سے مانگ بچوں سے

گودی بھری رہے''، جیسے اظہارات کا نہیں بلکہ زبان کے سانس لیتے ہوئے زندہ دھڑکتے ہوئے لہجے سے تخلیقی کام لینے کا ہے جو اس تہذیب و معاشرت سے گتھا ہوا تھا جس کو بالعموم اودھ کلچر کہا جاتا ہے۔ اس تہذیبی (Ethos) قالب سے زبان کو الگ کرنا گویا زبان کو نرس اور Flat کرنا تھا کوئی عظیم فنکار ایسا نہیں کرسکتا۔ انیسؔ نے ایسا نہیں کیا۔ چنانچہ اس سے انیسؔ پر اعتراض کا نہیں بلکہ انیسؔ کی عظمت کا پہلو نکلتا ہے کہ انیسؔ نے زبان کو اس کے تمام تخلیقی امکانات کے ساتھ اس درجہ حرارت پر استعمال کیا جو زندگی کی دردمندی کی ترسیل کے لئے ضروری تھا ورنہ ہر شے Flat ہوجاتی۔ چنانچہ وہی عرب کردار جو تاریخی خاکہ بھر تھے، انیسؔ کے یہاں غیر معمولی طور پر جیتے جاگتے اور دکھ کا بوجھ ڈھوتے ہوئے حق کی پاسداری کے لئے اس قربانی کے حصے دار نظر آتے ہیں جو انسانیت کی تاریخ میں فقید المثال ہے۔''

پروفیسر گوپی چند نارنگ کا یہ مضمون انیسؔ کی معجز بیانی تہذیبی جہات بہت اہم مضمون ہے دنیا جانتی ہے کہ کربلا کے واقعات یا امام حسین کا تعلق سعودی عرب اسلامیات سے ہے اور وہاں کی تہذیب وہاں کے کلچر سے ہے کربلا میں شہید ہونے والے ان تمام لوگوں سے ہے جن کا رشتہ آلِ رسول سے ہے، میر انیسؔ جو کہ مرثیہ کے بادشاہ تسلیم کئے جاتے ہیں جن کی فصاحت و بلاغت سے اہل ادب خوب واقف ہیں۔ ظاہر ہے مرثیہ میں جو کردار ہیں یعنی حضرت امام حسین، حضرت عباس یا ان کے تمام خاندان والے ان سب کا تعلق بھی عربی تہذیب سے ہے لیکن مرثیہ جو کہ کربلا کے واقعات یا کربلا میں شہید ہونے والے انہی کرداروں سے ہے جو میر انیسؔ کے مرثیوں کے کردار ہیں، ظاہر ہے مرثیے کے اجزائے ترکیبی تشبیب، گریز، رجز، جنگ، بین وغیرہ

ہیں اور جنگ میں کام آنے والے ان ہتھیاروں کا ذکر جیسے تلوار، خنجر، زرہ بکتر کا جب ذکر کیا جائے گا تو اس میں ہندوستانی تہذیب کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، اول تو میر انیسؔ کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے اپنے مرثیوں کے حوالے سے لکھنوی تہذیب اور اودھ کی تہذیب کو بھی پیش کر دیا ہے اور پروفیسر گوپی چند نارنگ نے میر انیسؔ کی معجز بیانی، تہذیبی جہات کو پیش کرتے ہوئے مرثیے میں بھی ہندوستانی تہذیب کو تلاش کر لیا۔ بلاشبہ یہ ایک دانشور نقاد ہی کر سکتا ہے۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ نے اپنے تنقیدی ہر مضمون میں ہندوستانی تہذیب کو نہ صرف تلاش کیا ہے بلکہ اپنے منفرد علمی دلائل سے ثبوت بھی فراہم کر دیا، ان کے دیگر مضامین مثلاً ''فیض کو کیسے نہ پڑھیں''، ''عالی جی کے من کی آگ''، ''جمیل الدین عالی اور آٹھویں سر کی جستجو''، ''محمد علوی کی شاعری اور احساس کا دوسرا پن''، ''منٹو کی نئی پڑھت متن ممتا اور خالی سنسنان ٹرین''، ''چند لمحے بیدی کی ایک کہانی کے ساتھ''، ''مدرسے اور مولسری سے لگی کہانی'' اور اسی نوعیت کے تمام تنقیدی مضامین میں پروفیسر گوپی چند نارنگ نے اپنے علمی، فکری اور دانشورانہ طریقے سے نئے نئے پہلو تلاش کئے ہیں۔ یہاں ان کے ایک اور تنقیدی مضمون مشہور افسانہ نگار انجم عثمانی کی کہانیوں پر لکھتے ہوئے اس طرح گویا ہوتے ہیں:

> ''انجم عثمانی ہر چند کہ اپنی تخلیقی شناخت تہذیبی کرائسس، مسلمان متوسط طبقے کی معاشرت کی فضا سازی اور اقلیتی معاملات و مسائل کی دردمندی سے قائم کرتے ہیں لیکن ان کی بعض کہانیوں میں مولسری کا ایک پیڑ بھی اگتا ہے جس کے پھولوں کی رنگت اور بھینی بھینی بو سے گھر آنگن اور کبھی کبھی پورا معاشرتی وجود مہک اٹھتا ہے۔ غالباً یہ بچے بوڑھوں، کم سن لڑکے لڑکیاں یا ادھیڑ عمر کی عورتوں کا معاشرتی اندرون بھی ہے جہاں گھر آنگن کی چہار دیواری کی چہچہاہٹ اور گھریلو پیار محبت کی اپنائیت ہے۔ کہیں

کہیں جنس کی دبی دبی چنگاری بھی ہے لیکن وہ شعلہ نہیں بنتی بلکہ
ارتفائی طور پر ممتا کے دست شفقت میں ڈھل جاتی ہے۔ شاید یہ
کیفیت بھی اس بنیادی معاشرتی منظر نامے کا ایک حصہ ہے جو
کرائسس سے دوچار ہے۔ لیکن زندگی تو زندگی ہے جہاں بھی
موقع ملتا ہے، یہ دہک اٹھتی ہے لو دینے لگتی ہے۔ فنکار کا ایک کام
یہ بھی تو ہے کہ درد کے دشت سے گزرتے ہوئے بشارت کی آواز
پر نظر رکھے۔''

پروفیسر گوپی چند نارنگ نے انجم عثمانی کی کہانیوں میں بھی ہندوستانی تہذیب اور یہاں کی معاشرت کو تلاش کرلیا ہے جیسے گھر آنگن، پھولوں کی رنگت، بھینی بھینی خوشبو، چہار دیواری، غرض یہ کہ پوری معاشرتی فضا کو پیش کردیا ہے۔

جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے کہ پروفیسر گوپی چند نارنگ کی یہ کتاب جدیدیت کے بعد میں وہ مضامین شامل ہیں جو وہ وقتاً فوقتاً لکھتے رہے ہیں یا سیمینار میں پڑھتے رہے ہیں انہی مضامین کو جدیدیت کے بعد کے عنوان سے کتابی شکل میں شائع کیا گیا ہے اس کتاب میں نارنگ صاحب کے ایسے ایسے مضامین شامل ہیں جن کے موضوعات ہی تحقیق طلب ہیں ایسے منفرد موضوعات پر پروفیسر نارنگ نے اتنے معلوماتی مضامین تحریر کئے ہیں کہ جنہیں پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ نارنگ صاحب ایک دانشور نقاد ہی نہیں ایک بڑے فلاسفر بھی ہیں۔ ادب کا ایسا کون سا موضوع ہے جس پر نارنگ صاحب نے اظہار خیال نہیں کیا۔ مابعد جدیدیت کے عالمی تناظر میں تمام عالمی ادب پر ایک گہری طائرانہ نظر ڈالتے ہوئے ایسے ایسے موتی تلاش کئے ہیں جو ادب کا ایک قیمتی اثاثہ تسلیم کئے جاتے ہیں۔ ترقی پسندی، جدیدیت، مابعد جدیدیت سے بحث کرتے ہوئے بہت سے روشن زاویے تلاش کئے اور تاریخی، علمی، ادبی گفتگو کرتے ہوئے، بحث کرتے ہوئے اردو ادب کی تمام اصناف پر بڑی تفصیل سے لکھا ہے یعنی جدید نظم کی شعریات پر

تنقید کی بدلتی ترجیحات پر کبھی اکتشافی تنقید کی شعریات پر، کہیں ہندوستانی فکر اور فلسفہ پر بہت ہی معلوماتی مضامین تحریر کئے ہیں کہ جنہیں پڑھ کر ادب کا پورا پس منظر سامنے آجاتا ہے کہ ادب کیا تھا کیا ہے اور کیا ہونا چاہئے اور اس پوری کتاب میں سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ ادب میں تبدیلی کا ہونا نہ صرف ناگزیر ہے بلکہ نئی تبدیلیوں سے ہی ادب پروان چڑھتا ہے۔ جو لوگ ادب میں تبدیلیوں سے گریز کرتے ہیں گویا وہ اچھا ادب ہی تخلیق نہیں کر سکتے جہاں ایک طرف اس کتاب میں ادب کے بدلتے رویوں سے بحث کی گئی ہے وہیں دیگر کچھ مضامین ایسے بھی ہیں جو ان کی پسندیدہ شخصیات سے متعلق ہیں مثلاً کبیر کا جادوئی برتاؤ، انیسؔ کی معجز بیانی، فیض کو کیسے نہ پڑھیں عالی جی کی من کی آگ اور دیگر بہت سے ایسے مضامین شامل ہیں جو اردو ادب میں بدلتے رویوں اور زبان سے متعلق نئی تبدیلیوں سے جڑے ہوئے ہیں۔ اس سے پہلے کہ ان مضامین پر گفتگو کی جائے نارنگ صاحب سے لئے گئے ایک اہم انٹرویو میں جو گفتگو کی گئی ہے جو مکالمات ہوئے ہیں جو روزنامہ نیشن لاہور کے علاوہ کئی کتابوں اور رسائل میں شائع ہو چکے ہیں اس انٹرویو کے جواب دیتے ہوئے نارنگ صاحب نے پوری ادبی تاریخ بیان کر دی ہے۔ ہر موضوع پر کھل کر گفتگو کی گئی ہے۔ سوالات کرنے والوں میں پروفیسر ابوالکلام قاسمی اور شافع قدوائی ہیں۔ چند سوالات یہاں بطور نمونہ پیش کئے جاتے ہیں ابوالکلام قاسمی شافع قدوائی کے علاوہ روزنامہ نیشن اور مشتاق صدف کے ان تینوں انٹرویو بہت ہی اہم ہیں چونکہ ابوالکلام قاسمی، شافع قدوائی نے نارنگ صاحب سے زیادہ تر زبان سے متعلق اسلوبیات و ساختیات سے متعلق سوال کئے ہیں اور یہ نارنگ صاحب کا بہت اہم کام سہی لیکن اتنا الجھا ہوا اور غیر مانوس ہے کہ وہ بیچارے عام قاری کے تو سر سے ہی گزر جاتا ہے اس میں قاری پر صرف رعب ضرور پڑتا ہے لیکن اس تحریر میں کسی کو بھی ذرا سی دلچسپی نہیں رہتی اور میں تو ایک ادنیٰ طالب علم ہوں ساختیات پس ساختیات جیسی اصطلاحوں کو میں تو سمجھنے سے قاصر ہوں اس لئے انٹرویو کے ایسے سوالات پر گفتگو کرنا چاہوں گا جس میں

عام قاری کی بھی دلچسپی برقرار رہے اور کچھ میں بھی سمجھ سکوں۔ مشتاق صدف کے ایک سوال کے جواب میں نارنگ صاحب کا ایک اقتباس پیش کیا جاتا ہے۔

سوال: ہم نے ادب کو مختلف خانوں میں تبدیل کر دیا ہے جس سے نئی نسل کشمکش کا شکار ہے وہ یہ سوچنے پر مجبور ہے کہ اپنی تخلیقات اور فن پاروں کو وہ کس خانے میں رکھیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ کسی نظریے یا رویے پر اب ان کا یقین نہیں رہا۔ ایسا کیوں؟ اس الجھن سے نئی نسل کا ادیب کیسے نمٹے، آپ ہی کچھ بتائیے؟

جواب: بیشک پرانے نظریوں کے طلسم ٹوٹ گئے۔ پرانے نظریے القط ہو گئے۔ پرانے مہا بیانیہ سب نمٹ گئے۔ مابعد جدیدیت فلسفی لیوتار اور جیمی سن بھی یہی کہتے ہیں۔ لیکن یہ بھی تو ضروری ہے کہ لکھنے والا اپنی اقدار کی بازیافت اپنی تخلیقی طلب کے طور پر کرے۔ تخلیقی اقدار کی آگ سے خالی نہیں ہو سکتی۔ یہ کس نے کہا ہے کہ ادیب خود کو خانوں میں رکھ کر لکھے، آپ بڑے ادیبوں کے کام پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ انھوں نے خود کو کبھی چھوٹے چھوٹے خانوں میں قید نہیں کیا۔ قرۃ العین حیدر نے کبھی خود کو کسی خانے میں نہیں رکھا، انتظار حسین نے بھی اپنے آپ کو محدود کر کے کبھی نہیں رکھا، یہی معاملہ ناصر کاظمی، منیر نیازی اختر الایمان کا بھی ہے اگر چہ بہت سے جدیدیت والے یہ دعویٰ کریں گے کہ اختر الایمان ان کے شاعر تھے لیکن اختر الایمان کے دیباچوں کو پڑھیے وہ صاف صاف کہتے ہیں کہ ان کا ذہن اشتراکی ہے۔ ترقی پسندی کی جولانی تھی بالکل کھلی ہوئی، پولیٹیکل مینی فیسٹو والی، اس سے انھوں نے خود کو وابستہ نہیں کیا لیکن ذہنی سطح پر وہ اشتراکی تھے۔ مجھے نئی پیڑھی کے لکھنے والوں سے یہ کہنا ہے کہ وہ ادب کے بارے میں اپنے ادبی و اقداری موقف کے بارے میں سوچیں ضرور کہ جس نظریہ حیات کو وہ اپنانا چاہتے ہیں وہ کیا ہے؟ وہ جو

کچھ لکھ رہے ہیں اس کی معنویت کیا ہے۔ جب وہ اپنی values کے بارے میں سوچیں گے کہ کن values کو ترجیح دیتے ہیں تو اپنے آپ یہ طے ہو جائے گا کہ ان کا نظریہ اقدار کیا ہے۔ ویسے مابعد جدیدیت اس لحاظ سے پرانے فلسفوں، پچھلی تحریکوں اور نظریوں سے الگ ہے کہ خود مابعد جدیدیت کسی نظریہ کا بت نہیں بناتی۔ وہ ہر نظریے کو رد کرتی ہے، لیکن اپنا کوئی محدود یا متعینہ نظریہ نہیں دیتی۔ مابعد جدید فکر کھلا ڈلا تخلیقی رویہ ہے۔ یہ ہرگز اپنے کو define یا محدود نہیں کرتی۔ مابعد جدیدیت کا یہ موقف بڑا نازک ہے کہ وہ کسی نظریہ کا بت نہیں بناتی۔ اس لئے بعض لوگوں کو اتنی کھلی فکر کو سمجھنے میں دقت ہوتی ہے کیونکہ لوگ Concreteوحدانی سکہ بند نظریہ چاہتے ہیں جیسے ترقی پسندی تھی یا جدیدیت تھی۔ مابعد جدید فکر ایسا کوئی سکہ بند وحدانی بندھا ٹکا نظریہ نہیں دیتی اس لئے کہ سب نظریے ادھورے اور ادعائیت شعار ہیں۔ مابعد جدید فکر فنکار سے کہتی ہے کہ اپنی اقدار تخلیقی طور پر خود قائم کرو۔''

مشتاق صدف کے سوال کے جواب میں نارنگ صاحب نے جس ادبی نوعیت کے جواب دیئے ہیں وہ سارے ادبی پس منظر کی عکاسی کرتے ہیں اس ایک سوال کا جواب ہی انہوں نے جس عالمانہ انداز سے دیا ہے کہ ترقی پسندی جدیدیت سے متعلق نہ صرف ساری غلط فہمیاں دور ہو جاتی ہیں بلکہ وہ سارے نظریات جو اپنا وقار ختم کر چکے ہیں جس کا طلسم بھی ٹوٹ چکا ہے یعنی پچھلی ساری تحریکوں نظریوں سے ہٹ کر جدیدیت کے بعد جو کھلی فضا تخلیق کاروں کو میسر آئی ہے وہ تمام باتیں اور ان کے جوابات اس مختصر سے اقتباس میں موجود ہیں۔ سچائی تو یہ ہے کہ جدیدیت کے بعد اس کتاب میں جہاں نارنگ صاحب کے بہت سے تنقیدی مضامین شامل ہیں وہیں دوسری طرف سب سے اہم جنہیں کتاب کی جان کہا جائے تو غلط نہ ہوگا وہ ہیں ان کے انٹرویو، سوال کرنے

والوں نے بھی ایسے ایسے سوال کئے ہیں کہ کوئی پہلو تشنہ نہیں رہا مثلاً اسلوبیات کیا ہے؟ اس کا تفاعل اور میدان کار کیا ہے اس کا اطلاق کرتے ہوئے متن سے کیا نتائج اخذ کئے جاسکتے ہیں؟ کیا آپ اس سے اتفاق کرتے ہیں کہ اسلوبیات ادبی متن کی جمالیاتی تحسین نہیں کرسکتی کیا اسلوبیات تنقید کو فقط ایک سائنسی بنیاد دینے یا اس کے لئے سائنسی راہ ہموار کرنے سے عبارت ہے اس انٹرویو میں زیادہ تر سوالات اسلوبیات سے متعلق ہی کئے گئے ہیں جن کا جواب پروفیسر نارنگ نے بہت ہی تفصیل سے دلائل سے اپنے گہرے مطالعہ اور مشاہدے کی روشنی میں دیئے ہیں ان جوابات میں پروفیسر گوپی چند نارنگ کی ساری قابلیت علمیت پوشیدہ ہے، یہ جوابات ہی نارنگ صاحب کی پوری تنقید اور ادب سے متعلق ان کے تمام نظریات کو واضح کرتے ہیں۔ ایک سوال اس طرح ہے جو دُریدا کے حوالے سے ہے جس میں ڈاکٹر وزیر آغا اور شمس الرحمٰن فاروقی کے نظریات سے بھی بحث کی گئی ہے سوال کچھ اس طرح ہے ڈاکٹر وزیر آغاز کا کہنا ہے کہ دُریدا کی موجودگی نے مابعد الطبیعات کو رد نہیں کیا فقط ساخت میں مرکز کے تصور کی جگہ نمو نے لے لی ہے۔ دوسرا سوال جوتھیوری سے متعلق ہے وہ یہ ہے کہ آپ کے معاصرین میں شمس الرحمٰن فاروقی نے نئی تھیوری کو شعر شور انگیز میں میر تقی میر کی شاعری پر برتا ہے آپ کی کیا رائے ہے؟ اس سوال کا جواب بہت اہمیت رکھتا ہے جو کہ ادب کی ساری فضا اور جدیدیت کے طلسم کو اس کے پرزے پرزے کرنے کو کافی ہے وہ لکھتے ہیں۔

جواب: شمس الرحمٰن فاروقی کے علم وفضل کی میں قدر کرتا ہوں لیکن ان کے تنقیدی اوزار ہیئتی ہیں اور یہ امریکی نیو کریٹیسزم سے مستعار ہیں۔ ساختیاتی فکر کی رو سے ہیئتی اندازِ نقد بورژوا ہے۔ ساختیاتی فکر اور پس ساختیاتی فکر ہیئتی تنقید کی سخت مخالف ہیں۔ ان کا موقف کہ ادب آئیڈیولوجیکل ڈسکورس کی تشکیل ہے۔ نیو کریٹسزم کے پیروکاروں کی موضوعیت، سے بالکل مخالف پڑتا ہے۔ فاروقی صاحب نے ادب کی سماجی معنویت کو ہمیشہ مسترد کیا ہے۔ اس کے

باوجود نئی تھیوری کی بہت سی بصیرتوں کے وہ قائل بھی ہیں اور انہوں نے ان سے استفادہ بھی کیا ہے۔ میری حقیر رائے میں اس میں تناقص کا پہلو نکلتا ہے۔ دُریدا کو انہوں نے خواہ مخواہ اپنا مسئلہ بنالیا ہے۔ شعر شور انگیز کے دیباچوں میں رد کی خواہش اس قدر شدید ہے کہ دور از کار نتائج اخذ کرنے میں بھی ان کو عار نہیں۔ میں ان کے علم کا قائل ہوں لیکن تنقیدی فیصلوں کا نہیں۔ ان کے بہت سے تنقیدی فیصلے میرے نزدیک مشکوک ہیں۔ ان کا یہ کارنامہ معمولی نہیں کہ انہوں نے ترقی پسندوں کو دفاعی مورچہ سنبھالنے پر مجبور کردیا تھا۔ لیکن کیا یہ افسوسناک نہیں کہ آج وہ خود دفاعی مورچہ اختیار کرنے پر مجبور ہیں حالانکہ وہ نئی تھیوری کی بصیرتوں سے خوب خوب مستفید ہونے کا پتہ دیتے ہیں۔ یہ ان کے دل کا چور ہے جس کو وہ چھپاتے ہیں۔ اگر کوئی کہے تو وہ برا مان جاتے ہیں۔ اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ان کے یہاں دو وفاداریوں میں شدید کشمکش ہے۔ یعنی ایک طرف جدیدیت اور وہ بھی عالی جدیدیت اور دوسری طرف کلاسکیت یعنی عالی کلاسکیت۔ شعر شور انگیز میں یہ دونوں نمایاں ہیں۔ یعنی اگر ادب خودکفیل اور خودمختار ہے اور معنی وحدانی ہے تو تکثیرت کیسی۔ یہ تو دوغلا پن ہے۔ ان کا معنی کا تصور ردتشکیلی نہیں ہیئتی ہے۔ شعر شور انگیز میر کے منتخب اشعار کی شرح ہے۔ اگر وہ ہیئتی نقطہ نظر سے میر پر تنقیدی کتاب لکھ دیتے تو وہ زیادہ قابل قدر ہوتی۔''

شمس الرحمٰن فاروقی سے متعلق نارنگ صاحب کا یہ اقتباس ادب کے بہت سے بحث کے دروازے کھولتا ہے اس لئے کہ اس میں فاروقی صاحب کی جدیدیت اور کلاسیکیت پر ان کا جھکاؤ اس بات کا ثبوت ہے کہ ترقی پسندی کی طرح جدیدیت بھی اب ختم ہوچکی ہے۔ اس اقتباس میں جس کے بارے میں پچھلے صفحات میں بھی ذکر کیا جاچکا ہے کہ ہر نقاد جب دنیائے ادب میں اسٹیبلش ہوجاتا ہے اور اس کا لکھا ہوا حرفِ آخر

کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے تو پھر ادب میں اپنی دھاک قائم کرنے کے لئے غلط کو صحیح اور صحیح کو غلط ثابت کرنے کی ناکام کوشش کرنے لگتا ہے۔ جبکہ ادب میں حرفِ آخر کچھ نہیں ہوتا ہمیشہ چراغ سے چراغ جلانے کی روایت قائم رہتی ہے یہاں ہمارا مقصد یہ نہیں ہے کہ ترقی پسندی کے زوال اور جدیدیت کے اختتام کی وجوہات کیا ہیں اور نہ پروفیسر نارنگ کی مابعد جدیدیت کی حمایت میں کچھ لکھنا ہمارا مقصد ہے بلکہ عرض کرنا یہ ہے کہ ادب میں نئی تبدیلیوں کا ہونا ضروری ہے اس لئے کہ یہی نئی تبدیلیاں ادب کے فروغ کا ضامن ہوتی ہیں جو لوگ ایک ہی موضوع یا ایک ہی بات کو منوانے پر بضد رہتے ہیں وہ ادب کی راہ میں کانٹے بوتے ہیں حسن عسکری جیسے نقاد کی مثال ہمارے سامنے ہے وہ اکثر دو چار پانچ سال میں ہی اپنے پرانے لکھے ہوئے کو غیر مستند قرار دے کر اپنی دوسری رائے کو مستند بنانے میں ماہر تھے جیسے جیسے مطالعہ اور مشاہدہ ان کا بڑھتا جاتا تھا وہ اپنے نظریات میں بھی تبدیلی پیدا کر لیتے تھے۔ گیان چند جین نے بھی اکثر یہی کیا ہے۔ جن نقادوں نے اپنے نظریات دوسروں پر زبردستی تھوپنے کی کوشش کی ہے یا تو وہ اپنی شکست کا اعتراف کر چکے ہیں یا وہ تحریک ہی ختم ہوگئی ہے۔ ترقی پسندی اور جدیدیت کا بھی یہی انجام ہوا اور ہونا تھا جدیدیت کے بعد نئی نسل نے ہر تحریک ہر نظریے سے اختلاف کیا اور آزادیٔ اظہار کو اپنا وسیلہ بنایا اور جن نقادوں نے اس کا اعتراف کیا ادب میں نئی تبدیلیوں کا استقبال کیا ان میں سب سے بڑا نام پروفیسر گوپی چند نارنگ کا ہے۔ پروفیسر نارنگ نے اتنا کچھ لکھا ہے کہ ان کی تنقیدی اور ادبی خدمات کا اعتراف ساری دنیا نے کیا ہے۔ ابھی حال ہی میں ایک کتاب ''ترقی پسندی جدیدیت مابعد جدیدیت'' کے عنوان سے آئی ہے۔ جسے ایڈشاٹ پبلیکیشن ممبئی کے مالک اطہر عزیز نے بہت خوبصورت سلیقے سے شائع کی ہے۔ 670 صفحات پر مشتمل اس کتاب میں نارنگ صاحب کے منتخب مضامین کے ساتھ ساتھ دنیا کے تمام معتبر نقادوں نے نارنگ صاحب کی ادبی خدمات کا کھل کر اعتراف کیا ہے۔ یہاں کچھ معتبر نقادوں کی رائے پیش کی جاتی ہے۔

مشفق خواجہ لکھتے ہیں:

''ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے ظاہری اور باطنی کمالات کا احاطہ کرنا بہت مشکل ہے وہ اعلیٰ درجے کے نقاد اور ماہر لسانیات ہیں۔ ان کی نقادی کا لوہا فضیل جعفری جیسے نیک مزاج نے بھی مانا ہے جو اپنے علاوہ کسی اور کو نقاد ماننے سے پہلے سو مرتبہ سوچتے ہیں اپنے بارے میں اس لئے نہیں سوچتے کہ مسلمات پر بحث کرنا ان کی عادت نہیں۔ ڈاکٹر نارنگ کو ماہر لسانیات ہونے کی سند ڈاکٹر گیان چند نے بھی عطا کی ہے۔ جو خود اس میدان کے شہسواروں میں سے ہیں۔ اور شہسوار بھی ایسے کہ ایک مرتبہ انہوں نے ڈاکٹر شوکت سبزواری جیسے جید عالم کو بھی اپنے توسنِ لسانیات کی گرد بنا ڈالا تھا اور بعد میں معذرت بھی کی تھی۔ ڈاکٹر نارنگ کے سلسلے میں وہ معذرت کا ارادہ نہیں رکھتے۔''

مشفق خواجہ نے چند لفظوں میں پروفیسر نارنگ کا ان کی شخصیت کو اور ان کی ادبی خدمات کو چند لفظوں میں بیان کر دیا ہے اور اس بات کا بھی اعتراف کیا ہے کہ ان کے ظاہری اور باطنی کمالات کا احاطہ کرنا بہت مشکل ہے۔ اس لئے کہ وہ اعلیٰ درجے کے نقاد بھی ہیں ماہر لسانیات بھی ہیں اور بہترین مقرر بھی ہیں ان کی تقریر اور تحریر کا جادو یکساں ہوتا ہے۔ مشفق خواجہ کے علاوہ یہاں ایک اور معتبر شخصیت فرمان فتحپوری کا ایک اقتباس پیش ہے:

''ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے ذہن و قلم، ادیب کی ان دونوں بنیادی صفات کے حامل ہیں اور سچ یہ ہے کہ اپنی انہیں صفات کی بدولت انہوں نے نہ صرف برصغیر پاک اور ہند میں بلکہ اس سے بھی پرے مشرق و مغرب دونوں میں ایسی شہرت و تکریم حاصل کر لی

ہے جو بین الاقوامی سطح پر اردو والوں کے لئے باعث افتخار و ناز بھی
ہے اور قابل رشک بھی۔ ایک کامل ادیب کی حیثیت میں ڈاکٹر
نارنگ کی قلمرو میں، کم وبیش ادب کے سارے ہی شعبے شامل ہیں۔
صوتیات و معنیات تعلیم و تدریس، لسانیات و اسلوبیات، شعریات
و سماجیات، ساختیات و پس ساختیات، کتابیات و لسانی تشکیلات
اور مسائل املا و لغات سے لیکر اہم اصناف سخن مثنوی، غزل،
دوہا، جدید نظم، افسانہ، ناول، صحافت، ادب، موسیقی تک شاید ہی کوئی
موضوع ہوگا جس پر ڈاکٹر نارنگ نے قلم نہ اٹھایا ہو اور تحقیق و تنقید
کا حق نہ ادا کیا ہو، خاص بات یہ ہے کہ وہ قدیم و جدید اور مغرب و
مشرق، دونوں کی ادبی روایات اور ان کی نظریاتی و ثقافتی اساس
سے آشنا ہیں اور یہ اسی آشنائی کا کرشمہ ہے کہ ان کی ادبی تحریریں
اپنے اندر ایک ایسا جہانِ معنی رکھتی ہیں جو ادب کے عام و خاص
قاری دونوں کے لئے یکساں جاذب نظر و دامن کش ہے۔''

مشفق خواجہ اور ڈاکٹر فرمان فتحپوری کے علاوہ دنیا میں کون ایسا بڑا نقاد شاعر ادیب ہوگا جس نے پروفیسر نارنگ کی ادبی خدمات کا اعتراف نہ کیا ہوگا۔ قمر رئیس انتظار حسین، شمس الرحمن فاروقی، فضیل جعفری، ڈاکٹر صادق، تمکین، محمد ایوب واقف، کے علاوہ درجنوں شاعروں ادیبوں نقادوں نے پروفیسر نارنگ کی تنقید نگاری اور ان کی دیگر تصنیفات پر بہت کچھ لکھا ہے۔ کسی نے ان کے افسانے سے متعلق تنقید نگاری پر گفتگو کی ہے کسی نے مابعد جدیدیت کے حوالے سے تو کسی نے ماہر لسانیات کے حوالے سے، کسی نے انہیں اپنا رقیب جانا تو کسی نے دوست ڈاکٹر محمد ایوب واقف نے انہیں علم و فنون کا نادر خزینہ کہا ہے کسی نے ان کی تقریر کے حوالے سے گفتگو کی ہے، تو کسی نے ان کی تحریروں کے حوالے سے، ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے نارنگ صاحب کی پہلی تصنیف کی

روشنی میں گفتگو کی ہے اور بتایا ہے کہ نارنگ صاحب نے ایسا کوئی موضوع نہیں چھوڑا ہے جس پر اظہار خیال نہ کیا ہو۔ شعریات، سماجیات، ساختیات، پسِ ساختیات، کتابیات، صوتیات، معنیات غرض یہ کہ قدیم و جدید افسانہ ناول مشرق ومغرب کے تمام ادب کو نہ صرف کھنگال ڈالا ہے بلکہ اپنے پورے علمی ادبی گہرے مطالعہ اور مشاہدے کی روشنی میں جو کچھ لکھا ہے وہ ادب کے قیمتی سرمائے کی حیثیت رکھتا ہے لیکن مابعد جدیدیت پر ان دنوں جو گفتگو چل رہی ہے اور نئے نئے گوشے سامنے آرہے ہیں وہ نارنگ صاحب کا تازہ تازہ کارنامہ ہے۔ اس سلسلہ میں پاکستان کے مشہور افسانہ نگار انتظار حسین لکھتے ہیں:

> ''ڈاکٹر نارنگ کی یہ بات نظر انداز کرنے کے لائق نہیں کہ جس طرح ترقی پسندوں کی حماقتوں سے سبق سیکھنے کی ضرورت تھی اسی طرح جدیدیت والوں کی حماقتوں سے بھی سبق سیکھنے کی ضرورت ہے۔ سچے کی بات یہ ہے کہ ادب آئیڈولوجی سے بیگانہ محض بھی نہیں۔ یہ وہ حماقت ہے جو جدیدیت والوں نے ترقی پسندوں کی ضد میں کی تھی۔ ڈاکٹر نارنگ بالاصرار کہتے ہیں اور ٹھیک کہتے ہیں کہ مابعد جدیدیت یا نیا ذہن سماجی و سیاسی مسائل سے غیر وابستہ نہیں ہوسکتا۔ اس کی زندگی اور اس کے گوناگوں سماجی و سیاسی مسائل کے تئیں حساس ہونا چاہیے۔ لیکن اس کا طریقہ کار ترقی پسندوں سے مختلف ہوگا اس اعتبار سے کہ ترقی پسند ایک آئیڈولوجی سے کمیٹڈ تھے اور اسی کو آخری سچائی مانتے تھے۔ مابعد جدید فکر کی رو سے کوئی آئیڈیولوجی اتنی مکمل یا بے عیب نہیں ہے کہ اس کو آخری سچائی مان لیا جائے۔ مابعد جدیدیت انسانی مسائل کے حل کے لئے کسی ایک آئیڈیولوجی یا کسی ایک نظریے پر اصرار نہیں کرتی۔

ڈاکٹر نارنگ کا کہنا ہے کہ مابعد جدید ذہن اکثر و بیشتر اسٹبلشمینٹ کے خلاف یا بائیں بازو کی طرف ملے گا وہ عوامی اور سوشلسٹ طاقتوں کے ساتھ ہوگا۔ تاہم اس ذہنی آزادی کا بھی تحفظ کرے گا کہ وہ اپنے نقطہ نظر کو خود وضع کر سکے۔''

جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں یہ مابعد جدیدیت کا وہ فکری خاکہ ہے جو ڈاکٹر نارنگ کی تحریرات سے ابھرتا ہے یہ نشاندہی بھی اسی حد تک ہے جہاں تک میں سمجھ پایا ہوں۔ اس کتاب کی خوبی یہ ہے کہ یہ سوچنے پر مجبور کرتی ہے اسی لئے اردو تنقید میں یہ بیش بہا اضافہ ہے۔''

انتظار حسین نے نارنگ صاحب کی مابعد جدیدیت سے صحیح لکھا ہے کہ یہ ذہنی آزادی کا دور ہے جب جب لکھنے والے پر پابندی عائد کی گئی ہے وہ اندر ہی اندر گھلتا رہتا ہے اور جب اسے موقع ملتا ہے تو یہ سارا لاوا اُبل کر اس کی تخلیق میں اجاگر ہو جاتا ہے۔ ایک اچھا اور سچا فنکار کبھی بھی یہ گوارا نہیں کر سکتا کہ اس کے اظہار پر پابندی عائد کی جائے ہر بڑے لکھنے والے نے اظہار کی آزادی کو نہ صرف اہمیت دی ہے بلکہ یہ ایک تلخ سچائی ہے کہ اچھے اور سچے تخلیقی فن پارے اظہار کی آزادی سے ہی وجود میں آتے ہیں مابعد جدیدیت یہی ہے کہ وہ نہ ترقی پسندوں کے نظریات کو تسلیم کرتی [illegible] جدیدیت سے کوئی سروکار۔ نارنگ صاحب کی اس بات کو ہر بڑے لکھنے والے نے تسلیم کیا ہے۔ انتظار حسین کے اس اقتباس سے اس بات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے نارنگ صاحب کا یہ بھی کہنا ہے کہ مابعد جدیدیت کوئی پتھر کی لکیر نہیں ہے نہ وہ لکھنے والوں پر پابندی عائد کرتی ہے ان کا کہنا تو صرف یہ ہے کہ کوئی بھی نظریہ تخلیق کار پر تھوپا نہیں جا سکتا ترقی پسندوں اور جدیدیوں نے یہی کیا ہے۔ جیسا کہ سب جانتے ہیں کہ ترقی پسندوں کے نظریات کے خلاف شمس الرحمٰن فاروقی صاحب نے مورچہ سنبھالا یعنی ترقی

پسندی کی ضد میں جدیدیت ابھری لیکن جس طرح ترقی پسندوں نے اپنے نظریات پر زور دیا اسی طرح جدیدیت نے بھی اسی نوعیت کی شدت اختیار کر لی مابعد جدیدیت نے ان دونوں کے خلاف مورچہ سنبھالا اور ساتھ میں یہ بھی واضح کر دیا کہ مابعد جدیدیت کسی ایک نظریے پر قائم نہیں ہے نہ وہ لکھنے والوں پر پہرہ بٹھاتی نہ ان سے یہ کہتی ہے کہ ایسا لکھو ویسا لکھو بس یہی مابعد جدیدیت کا امتیازی پہلو ہے جس پر بہت کچھ لکھا جا رہا ہے اور اس ساری مابعد جدیدیت کی باگ ڈور پروفیسر گوپی چند کے ہاتھ میں ہے۔ یہاں نارنگ صاحب کے نظریات اور ان کی مابعد جدیدیت سے متعلق دیگر نقادوں کی رائے پیش کی جاتی ہے۔ جس جدیدیت کے بعد یہ مابعد جدیدیت کا چرچہ عام ہوا ہے اسی جدیدیت کے بانی شمس الرحمٰن فاروقی کی رائے یہاں پیش کی جاتی ہے۔

''گوپی چند نارنگ! آپ میں ایک اور خوبی ہے جو شاید مجھ میں اور آپ میں مشترک ہے وہ یہ کہ آپ ادب کا مطالعہ غیر مشروط ذہن سے کرتے ہیں، ادب سے یہ تقاضا نہیں کرتے کہ وہ آپ ہی کے معتقدات اور تصورات کی ترجمانی کرے آپ اس بات پر اصرار کرتے ہیں کہ ادب اپنی جگہ خود ایک سچائی ہے۔ کوئی ضروری نہیں کہ یہ سچائی اس فلسفیانہ یا اخلاقی نظام سے ہر جگہ اور ہر طرح ہم آہنگ ہو جسے نقاد خود مانتا اور قبول کرتا ہے ادب کے ساتھ آپ کا Passionate Commitment یعنی انتہائی سچا، گہرا اور بے لوث لگاؤ مثالی حیثیت رکھتا ہے۔ اقبال ہوں یا غالب، میر، انیس ہوں یا آج کا کوئی نوجوان شاعر آپ ان سب کا مطالعہ یکساں خلوص و یقین کے ساتھ اور ذہن کی یکساں آزادی کے ساتھ کرتے ہیں۔ وہ نقاد ہی کیا جس کے ذہن کی تمام کھڑکیاں کھلی نہ ہوں اور جس کی شخصیت کے تمام گوشوں میں ادب کی محبت

خالصتاً ادب کی خاطر نہ ہو، افسوس ہے کہ ہمارے اکثر نقاد اس معیار پر کھوٹے نکلتے ہیں۔ آج کی خودغرض دنیا میں ادب اور صرف ادب کے ساتھ آپ کی گہری وابستگی ہمارے لئے امید کی کرن کا کام کرتی ہے۔

آخر میں ایک بات یہ بھی کہدوں کہ لسانیات اور تاریخ ادب اور ترجمہ بھی وہ میدان ہیں جن میں آپ دور دور تک تنہا نظر آتے ہیں۔ ہمارے اکثر معاصر یہاں آپ کے ہم عنان وہم رکاب تو کیا، آپ کے رہوار قلم کے پیچھے پیچھے بھی نہیں چل سکتے۔ میں تو صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ اس زمانے میں کیا ہر زمانے میں ادب کی اقدار کے نقاد بہت کم ہوئے ہیں۔ آپ ان چند میں بھی ممتاز ہیں۔ آپ کی ہر بات صحیح نہ سہی لیکن آپ کی کوئی بات نظر انداز کرنے کے لائق نہیں ہے۔''

اس اقتباس میں ایک معتبر نقاد نے معتبر نقاد کی صلاحیتوں کا اعتراف اس قدر خوبصورت انداز میں کیا ہے کہ جس کی مثال ملنا مشکل ہے نظریات میں اختلاف تو بہر حال ناگزیر ہوتے ہیں اس لئے کہ ادب اختلاف سے ہی پروان چڑھتا ہے لیکن یہاں ایک بڑے نقاد نے اپنے ہمعصر نقاد کی علمی قابلیت کا کھل کر اعتراف کیا ہے اور اس بات کی تعریف میں کہ نارنگ صاحب میں سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ ذہن کی کھڑکیاں کھلی رکھ کر ادب کے تمام گوشوں کا مطالعہ کرتے ہیں۔ فاروقی صاحب نے اس قدر پیارے ڈھنگ سے اپنے مضمون کا اختتام کیا ہے وہ یوں کہ میں تو صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ اس زمانے میں کیا ہر زمانے میں ادب کی اقدار کے نقاد بہت کم ہوئے ہیں آپ ان چند میں بھی ممتاز ہیں آپ کی ہر بات صحیح نہ سہی لیکن آپ کی کوئی بات نظر انداز کرنے کے لائق نہیں۔ بلاشبہ یہ جملے شمس الرحمٰن فاروقی نقاد ہی لکھ سکتے ہیں جبکہ مابعد جدیدیت

کے بعد دونوں کے نظریات میں زمین آسمان کا فرق ہے اور نظریات میں اختلاف بھی لیکن دونوں ایک دوسرے کی صلاحیتوں علمیت اور قابلیت کا کھل کر اعتراف کرتے ہیں یہی ایک بڑے نقاد ہونے کی پہچان ہے۔ ترقی پسندی جدیدیت مابعد جدیدیت میں اور بھی کئی بڑے معتبر نقادوں کے مضامین شامل ہیں جن میں پروفیسر گوپی چند نارنگ کے کارناموں اور ان کی تنقیدی علمی ادبی خدمات کا جائزہ لیا گیا ہے فضیل جعفری جن کے بارے میں مشفق خواجہ نے لکھا ہے کہ وہ خود سے بڑا کسی نقاد کو نہیں مانتے آیئے اب نارنگ صاحب کے بارے میں فضیل جعفری کیا لکھتے ہیں ملاحظہ فرمائیں:

''ڈاکٹر نارنگ کی تنقیدی بصیرت کا بہترین اظہار فکشن کی تنقید میں ہوا ہے لیکن اس کا ذکر آگے آئے گا، جہاں تک شاعری کا تعلق ہے میرے لئے یہ کہنا ممکن نہیں کہ ڈاکٹر نارنگ نے اپنے تمام تر مطالعے ذہنی شغف اور دلچسپی کے باوجود شاعری کے ساتھ اور خصوصاً جدید شاعری کے ساتھ انصاف نہیں کیا ہے۔ یعنی شاعری کے بارے میں انہوں نے جتنا لکھنا چاہئے تھا یا جتنا وہ لکھ سکتے تھے اس کا عشرِ عشیر بھی نہیں لکھا۔ میر، انیس اور اقبال کے متعلق ان کی اسلوبیاتی تنقید کا ذکر کر چکا ہوں۔ ان کے دوسرے مضامین میں ''غالب کا جذبہ حب الوطنی اور سنہ ستاون''، ''شعر جوہر اور جذبۂ شوقِ شہادت''، ''شعرِ حسرت کی سیاسی جہت'' اور ''شاعر حریت و فطرت جوش ملیح آبادی'' نہ صرف قابل ذکر بلکہ ایسے مضامین ہیں جنہیں نارنگ کی وسیع تر ذہنی اور تنقیدی دلچسپیوں کے ثبوت کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے۔ ان مضامین میں ان کا تنقیدی ذہن صوتیاتی اور اسلوبیاتی جکڑبندیوں سے تقریباً آزاد ہوکر، سماجی، سیاسی اور اخلاقی صورت حال سے پیدا ہونے والے ان انسانی

احساسات و جذبات کو پیش کرتا ہے جو شعر کی شکل میں ہمارے
سامنے آتے رہے ہیں۔ ان مسائل کے تعلق سے نارنگ نے
خاص لگن اور دقت نظری کا ثبوت دیا ہے۔ مثال کے طور پر مولانا
محمد علی جوہر کی سیاسی شخصیت اور ان کے سیاسی کارناموں نے ہماشما
کو اس حد تک مسحور کر رکھا ہے کہ ان کی شعری حیثیت اگر پوری
طرح فراموش نہیں کی گئی تو بڑی حد تک نظر انداز ضرور کر دی گئی۔''

اس اقتباس میں فضیل جعفری نے نارنگ صاحب کی تنقید کا مکمل جائزہ لیا ہے اور بتایا ہے کہ اسلوبیاتی تنقید سے زیادہ نارنگ صاحب کی تنقیدی بصیرت کا اظہار فکشن کی تنقید میں زیادہ ہوا ہے انکا کہنا یہ ہے کہ شاعری کی تنقید میں نارنگ صاحب جدید شاعری کے ساتھ انصاف نہیں کر پائے یہ موضوع بہت بحث طلب ہے جس پر بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے اور بحث کے کئی نئے دروازے کھل سکتے ہیں لیکن میں کوئی نقاد نہیں ہوں میں نے تو یہ مقالہ یا اس موضوع پر لکھنے کے لئے صرف گوپی چند نارنگ کی چند کتابوں کو موضوع بنایا ہے اور انہی کی روشنی میں پروفیسر نارنگ کی تنقید پر ایک سرسری نظر ڈالنا میرا مقصد ہے وہ بھی صرف اس لئے کہ پروفیسر نارنگ نے نئی نسل کا ساتھ دیا ان کے مسائل کو سمجھا سیمینار منعقد کئے کتابیں لکھیں مضامین تحریر کئے یعنی اپنی تحریر اور تقریر سے ادب میں نئی تبدیلیوں کو فروغ دیا اور انہیں رائج کرنے کا جوکھم بھرا کام ایک بلند پایا نقاد نے کیا اور اس طرح کیا کہ ساری ادبی دنیا میں چہل پہل ہوگئی جبکہ غور سے دیکھا جائے تو ان کی وہ ضخیم ضخیم کتابیں جن سے نئی نسل کا کوئی واسطہ ہی نہیں ہے مثلاً اردو مثنویاں اردو غزل اور ہندوستانی ذہن و تہذیب ہندوستان کی آزادی کی تحریک اور اردو شاعری وغیرہ وغیرہ۔ لیکن ان کے مطالعہ اور مشاہدے کا یہ عالم ہے کہ اتنا کچھ پرانا روایتی ادب کھنگا لنے کے بعد نئے مسائل اور نئی تبدیلیوں کی طرف ان کا رجوع ہونا ایک بڑے دانشور اور کشادہ ذہن نقاد کا علمی ثبوت دینا ان کا سب سے بڑا کارنامہ ہے یعنی ان کا مطالعہ ایک طرف

روایتی اور کلاسیکل ادب پر گہرا ہے تو دوسری طرف نئے رجحانات اور مغربی تنقید پر بھی ان کی گہری نظر رہی ہے یہاں لندن کے مشہور ادیب قیصر تمکین کے مضمون سے ایک اقتباس پیش کیا جاتا ہے:

"ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اردو کے وہ واحد نقد نگار ہیں جنہوں نے مغربی تنقیدی نظریات کا بالاستیعاب مطالعہ کیا ہے انہوں نے جدید نظریات سے اردو کے ادبی حلقوں کو روشناس ہی نہیں کرایا ہے بلکہ ان کی توضیح کرتے ہوئے انہیں مشرقی فکریات کے تناظر میں پرکھا بھی ہے۔ ڈاکٹر نارنگ نے جدید ترین نظریاتی بنیادوں اور میلانات سے بحث کی ہے اور ساختیاتی اندازِ فکر اور ادبی تنقید کے باہمی رشتہ کی وضاحت کی ہے اس سلسلے میں انہوں نے مغرب سے مرعوب ہوئے بغیر اپنی الگ شناخت متعین کرائی اور نئے فکری دبستانوں اور نقد ادب کے فلسفیانہ تقاضوں کو پوری طرح اپنی گرفت میں لیکر انہوں نے ایک منفرد بلکہ اجتہادی قدم یہ اٹھایا ہے کہ سنسکرت اور عربی و فارسی شعریات کی تفہیم بھی کی ہے۔

ڈاکٹر نارنگ کا مغربی اقدار حیات، ادب وفن اور عصری آگہی کا وقوف روایتی ناقدوں کی طرح ساختیات، پس ساختیات، ردتشکیل، مارکسی اندازِ نظر اور نئی تاریخی جہتوں کی بے سروپا فیشن ایبل گردان پر مبنی نہیں ہے۔ ان افکار کو دیکھنے جانچنے سے پہلے وہ ذاتی تعمیر نظر کی بنیاد اپنے وسیع اور کلاسیکی تصورات پر رکھتے اور انہی پر بھروسہ کرتے ہیں۔ چنانچہ ان کے مضامین میں ہر جگہ نت نئے رجحانات پر تفصیلی بحث ملتی ہے۔ اردو کے زیادہ تر

تنقید نگار مغربی اندازوں اور نظریوں کی یا تو تصریح کرتے ہیں یا
پھر حسن عسکری کی طرح ان پر مکمل تکیہ کرتے ہیں۔ ڈاکٹر نارنگ
کسی بھی رائج الوقت اصطلاح یا نظریے کو حقیقت کلی ماننے کے
قائل نہیں ہیں مسائل اور امور کو زیر بحث لاتے ہوئے ڈاکٹر
نارنگ کبھی کبھی تو ایسی نکتہ آفرینیوں سے کام لیتے ہیں جو بجائے خود
نظریات کی حیثیت اختیار کر لیتی ہیں''

قیصر تمکین کے اس اقتباس میں انہوں نے نارنگ صاحب کی تنقید نگاری پر مختصر لفظوں میں سب کچھ بیان کر دیا ہے کہ نارنگ صاحب نے مغربی ادب کا گہرا مطالعہ کرنے کے باوجود اپنی تنقید کی بنیاد مشرقی تہذیب پر رکھی ہے اور فارسی، عربی، سنسکرت، کے وہ تمام فن پاروں کی روشنی میں اردو تنقید میں نئے رجحانات سے بحث کرتے ہوئے ایک چیلنج کی شکل میں اردو تنقید کے معیار اور وقار میں اضافہ کیا ہے یہ بات ذہن میں رکھنا چاہئے کہ زیادہ تر نقادوں نے مغربی ادب کی تشریح کو اردو تنقید کے نام پر پیش کیا ہے اور ہر نقاد مغربی ادب سے مرعوب ہوتا نظر آتا ہے اور اردو قاری کو بھی مرعوب کرنے کی کوشش کرتا ہے اس طرح اردو والے احساس کمتری کا شکار ہوتے چلے آئے ہیں۔ اس لئے کہ زیادہ تر نقادوں نے انگریزی ادب کو اس طرح پیش کیا ہے جیسے اردو والے ابھی پیدا ہوئے ہوں ملٹن، شیکسپیئر، روسو، ارسطو، افلاطون کو اس طرح پیش کیا ہے ان کے نظریات اور خیالات کو دنیا کے سارے ادب کے مقابلہ میں اعلیٰ قرار دے کر پوری مشرقی تہذیب پر گویا ایک حملہ کیا ہے۔ یہ نہیں دیکھا کہ ہندوستانی تہذیب اور یہاں کا ادب کیا ہے اگر کبیرؔ، تلسیؔ، اقبالؔ، جوشؔ، میرؔ، امیر خسروؔ، غالبؔ کی شاعری اور ان کی زندگی کو دیکھتے۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ یہاں کے ادب کے ادیبوں اور شاعروں کی ان معیاری تحریروں کا موازنہ اور مقابلہ اس طرح کیا جاتا کہ شیکسپیئر، ملٹن، روسو کے مقابلے میں میرؔ، غالبؔ، اقبالؔ کو نہ رکھا جاتا تو کم از کم کمتر درجہ کا ہی نہ قرار دیا جاتا لیکن مغربی

ادیبوں شاعروں کو اس طرح پیش کیا جیسے میرؔ، غالبؔ کچھ نہ ہوں۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ کا سب سے بڑا کمال یہی ہے کہ انہوں نے مشرقی تہذیب اور ہندوستانی تہذیب سے جڑے تلسی، کبیر، امیر خسرو، سے لے کر سادھو، سنتوں اور روحانی پیشواؤں، ہندوستانی جنگلوں پہاڑوں، جھرنوں اور خوبصورت وادیوں، خانقاہوں سے تہذیبی چشموں کو ادب کے حوالے سے پیش کر کے ہندوستان کی عظمت اور اردو ادب اردو تنقید کا معیار اور وقار قائم کیا ہے اور سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ پورے روایتی ادب سے موتی نکال کر انہیں روشن ستاروں کی طرح جگمگا دیا ہے اتنا بڑا اور دانشورانہ عمل کر کے یعنی عملی قدم اٹھا کر سینکڑوں صفحات پر مشتمل کتابیں شائع کیں اور آج بھی ادب میں نئی تبدیلیوں کا استقبال نہ صرف خوش اسلوبی سے کیا بلکہ مابعد جدیدیت کا علم لے کر نئی نسل کے دوش بدوش کھڑے ہوگئے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جدیدیت کے بعد مابعد جدیدیت کی کیا ضرورت پیش آرہی تھی ۔ ایسی کونسی لکھنے والوں کی تخلیقات میں نئی تبدیلیاں رونما ہوئیں ہیں جنہیں مابعد جدیدیت کہا جائے جبکہ لکھنے والے وہی پڑھنے والے وہی یہی ایک سوال ایسا ہے جو قاری کو اور عام لکھنے والے کو نئی نئی الجھنوں کا شکار بنا رہا ہے جبکہ جدیدیت کے بانی شمس الرحمٰن فاروقی صاحب نے پہلے ہی اپنے مضامین میں یہ لکھدیا ہے کہ شعر کی ادبی حیثیت کیا ہے فن کے تقاضے کیا ہے جب تک اس کا تعین نہیں کیا جائیگا ہر تحریر تو معیاری تحریر نہیں کہی جاسکتی۔ جدیدیت نے تو ایک معیار قائم کیا ہے۔ فاروقی صاحب لکھتے ہیں :

> ''ہم نے کہا کہ جدیدیت یہ کہتی ہے کہ ادیب کو کسی مفروضے کسی نظریے کا پابند مت قرار دو۔ اس کو یہ مت کہو کہ تم کو یہ کام کرنا چاہئے۔ اگر اس کے جی میں آئے تو وہ کرے یہ کام بھی۔ مان لیجئے اگر میرے جی میں آتی ہے کہ میں آسام کی باڑھ پر یا کہیں پر بھی جس طرح بڑے بڑے واقعات دنیا میں ہورہے ہیں میرے

جی میں آئے میں ان کے بارے میں لکھوں، نہ آئے نہ لکھوں، کل لکھوں پرسوں لکھوں، کبھی یہ ہوا کہ فوراً لکھ دیا۔ کبھی چھ مہینے بعد لکھا ہے۔ ہمارے ایک دوست ہیں علی ظہیر صاحب انقلاب جب آیا ایران میں، اس وقت وہ وہاں موجود تھے ...علی ظہیر اتنا متاثر ہوئے کہ انہوں نے کئی نظمیں انقلاب ایران پر لکھیں۔ لکھ تو گئے مگر پھر ان کو خیال آیا کہ "یار، میں تو جدید شاعر ہوں" پھر مجھ کو انہوں نے لکھا خط میں کہ شمس الرحمٰن فاروقی صاحب، ایسا ہے کہ میں ایران میں تھا یہاں میں نے جذبہ اور ولولہ دیکھا لوگوں میں کہ کس طرح اس قوم نے اپنے سر سے غلامی کا جوا اتار پھینکا اور کس طرح سے خود کو سنبھالا۔ تو میں نے نظمیں کہی ہیں اس پر۔ تو اب مجھے خیال آرہا ہے کہ جدیدیت تو کہتی ہے نظم میں کوئی سیاسی حوالہ نہ ہو نظم میں ایسا کوئی سماجی انقلابی حوالہ نہ ہو تو اب میں کیا کروں؟ میں نے انہیں جواب دیا کہ کس نے آپ سے کہا کہ سیاسی سماجی حوالہ نہ ہو؟ جدیدیت تو صرف یہ کہتی ہے کہ خود کو مجبور نہ بنائیے۔ اس کو کہنے کے لئے اپنے کا پابند نہ بنائیے، یہ کہنے کے لئے کہ انقلاب آگیا ہے ایران میں تو ہم نظم لکھ دیتے ہیں، اگر جی چاہے، اگر اندر سے آواز آئے تو ضرور کہو..... تمہیں آزادی ہے جب تمہارا ضمیر متاثر ہو جب تمہارے دل سے کوئی آواز اٹھے تو تم اسے اپنے ادب شعر یا فن کے اظہار کا وسیلہ بناؤ، مگر صرف ادبی معیار کو سامنے رکھتے ہوئے۔ جوش اور ایمان اور قوت اور عمل دل، یہ سب اپنی جگہ ٹھیک ہے مگر اس سے شعر نہیں بنتا۔ شعر ہمیشہ بنتا ہے شعری ادبی معیارات محاسن اور ادبی اقدار کو سامنے رکھنے سے،

ادبی اقدار اگر سامنے نہیں ہیں تو باقی سب بے کار ہے۔''

اس اقتباس میں فاروقی صاحب نے یہ کہا ہے کہ جدیدیت یہ نہیں کہتی کہ آپ ایسا مت کرو یہ مت لکھو وہ مت لکھو یعنی ان کا کہنا یہ ہے کہ لکھنے والے کو اختیار ہے یعنی اظہار کی پوری آزادی ہے تو پھر مابعد جدیدیت کیا ہے وہ بھی تو اس بات پر زور دیتی ہے کہ لکھنے والے کو اظہار کی پوری آزادی ہے پھر تو جدیدیت مابعد جدیدیت جیسی بحثوں کا کوئی مطلب ہی نہیں رہ جاتا۔ اصل معاملہ یہ ہے کہ فاروقی صاحب کی اس تحریر پر برقرار رہتے یعنی عمل پیرا رہتے تو کوئی بات نہ تھی جیسا کہ انہوں نے اپنی اس تقریر میں بیان دیا ہے کہ جدیدیت یہ نہیں کہتی کہ یہ مت کہو وہ مت کہو بلکہ ہوا یہ ہے کہ انہوں نے ''شب خون'' میں شائع ہونے والی زیادہ تحریروں میں کھل کر ضرور نہیں کہا لیکن ان کے بیان اور تحریروں میں اور شب خون کے دیگر لکھنے والوں کی تحریروں میں ایسا سخت رویہ نظر آنے لگا جس سے یہ ظاہر ہوا کہ اب جدیدیت نے اتنی شدت اختیار کر لی ہے کہ وہ زبردستی لکھنے والے پر تھوپی جانے لگی یعنی کسی بھی تحریک یا رجحان میں شدت پیدا ہوئی ہے تو اس کے خلاف احتجاج ضرور ہوا ہے۔ سہ ماہی تمثیل کے ایڈیٹر امام اعظم اپنے اداریہ میں لکھتے ہیں:

> ''اردو ادب میں بھی تین ایسے تغیرات تخلیقی سطح پر دیکھے گئے جنہیں مختلف ناموں سے نوازا گیا اور چونکہ ہر زمانے میں رجحانات، تغیر کے سبب اپنی شکل اختیار کرنے لگتے ہیں اور وہ شخص جو تغیر کو گرفت میں کر کے نئے رجحان کو آگے بڑھاتا ہے اسے اس کا بانی مان لیا جاتا ہے۔
>
> جدیدیت کے امام شمس الرحمٰن فاروقی نے ایک Established قاعدے اور اصول جو کل تک تحریک کی شکل میں سکہ جمائے ہوئے تھے اسے یک لخت خارج کر دیا اور نئی راہ

متعین کرنے کے لئے کچھ ایسی سمتیں متعین کیں جن سے وقت
کے تقاضے پورے ہو رہے تھے۔ یہ الگ سی بات ہے کہ جب کوئی
نیا رجحان سامنے آتا ہے جب کوئی تبدیلی کا سلسلہ شروع ہوتا ہے تو
سیلاب میں خس و خاشاک بھی آجاتے ہیں اور محض اس نام پر اس
رجحان کو رد نہیں کیا جا سکتا اور وقت کا یہ تقاضہ پرانی قدروں کو
دھیرے دھیرے مسمار کر کے نئی قدروں کو Establish کر دیتا
ہے۔ جدیدیت کے دور میں بھی یہ بات سامنے آئی اور جب یہ
اپنے نقطۂ عروج تک پہنچنے کے قریب ہوئی تو اس میں شدت پسندی
کا عنصر غالب ہونے لگا اور یہی اس کے زوال کا سبب بھی بن
گیا۔"

اس کے بعد ایک نئے رجحان کے آمد کی دھمک محسوس
ہونے لگی اور اس میں ماقبل رجحان کی طرح پیچیدگیاں، گنجلک
خیالات اور Confusion کی کیفیت شروع ہوئی۔ حالانکہ وہ
تار جو ماضی، حال اور مستقبل کو جوڑتا رہتا ہے وہ سمٹنے لگا اور سمٹ
کر ایک نئے رجحان میں تبدیل ہوا۔ اور جسے مابعد جدیدیت کا
نام دیا گیا اور جس کے سالار گوپی چند نارنگ نے اس کو فروغ دینا
شروع کیا۔ مابعد جدیدیت کے خد و خال عکس در عکس، رنگ، نور،
جمال، ماورائیت کا کہر سب کچھ سمٹنے لگا اور ایک نئی دنیا کی سیر کے
لئے ادب میں تجربے ہونے لگے۔ کامیاب تجربے ہوئے اور آج
جدیدیت اپنی شناخت قائم کرنے کی جدوجہد میں مصروف ہے۔"

جدیدیت کی اسی شدت پسندی نے مابعد جدیدیت کو جنم دیا ہے جبکہ بقول
فاروقی صاحب کے کہ جدیدیت نے لکھنے والوں پر کوئی پابندی عائد نہیں کی ہے نہ انہیں

کوئی مخصوص موضوعات پر لکھنے کی ترغیب دی ہے تو پھر جدیدیت اپنے اختتام پر کیوں پہنچ گئی اس لئے کہ مابعد جدیدیت بھی تو یہی کہتی ہے کہ لکھنے والے کو اظہار خیال کی پوری آزادی ہے اس لحاظ سے دیکھا جائے تو جدیدیت اور مابعد جدیدیت میں کوئی فرق ہی نہیں ہے نئی نسل کو پھر کس بات کا شکوہ معاملہ صرف یہی ہے کہ جدیدیت نے شدت اختیار کر لی یہی شدت پسندی اس کے زوال کا سبب بنی اور مابعد جدیدیت جسے صرف ایک بینر کہا جائے تو غلط نہ ہوگا اس لئے کہ اس بینر تلے نئی نسل کے تمام لکھنے والے جمع ہو گئے جس طرح سے شمس الرحمٰن فاروقی صاحب نے جدیدیت کا پرچم پوری دنیا میں لہرایا اسی طرح پروفیسر نارنگ مابعد جدیدیت کا پرچم لے کر کھڑے ہو گئے۔ لیکن نارنگ صاحب نے نئے لوگوں کی حوصلہ افزائی بھی کی، انہیں راستہ بھی دکھایا اور آگے بڑھنے کے لئے منزل کا تعین بھی کیا جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ مجھے نہ جدیدیت سے نہ ترقی پسندی سے بغض ہے نہ مابعد جدیدیت سے محبت ہے میں تو صرف پروفیسر گوپی چند نارنگ کی چند کتابوں کی روشنی میں یہ مختصر مقالہ قلمبند کر رہا ہوں اور پروفیسر نارنگ کی تحریروں اور ان کی تنقید نگاری ان کے نظریات خیالات پر نظر ڈالتے ہوئے ان کی ادبی خدمات کا سرسری جائزہ لینا میرا مقصد ہے اس لئے کہ پروفیسر گوپی چند نارنگ ایک ایسے نقاد ایک ایسی شخصیت کا نام ہے جنہوں نے ادب لکھا ہے، ادب پڑھا ہے اور ادب جیا ہے۔ ان کی زندگی کا ہر پل اردو کی خدمت اور اردو سے متعلق تمام مسائل سے رہا ہے۔ اس بات کا اعتراف ہماری دنیا نے کیا ہے یہاں پروفیسر نارنگ کی تنقیدی ادبی خدمات سے متعلق ڈاکٹر محمد ایوب واقف صاحب کے ایک مضمون کا اقتباس پیش کیا جاتا ہے۔ پروفیسر نارنگ کی تنقید نگاری اور ان کی ادبی خدمات پر محمد ایوب واقف صاحب کا یہ مضمون دنیا کے کئی ادبی رسالوں اور کتابوں میں شائع ہو چکا ہے۔ واقف صاحب نے اس مضمون میں نارنگ صاحب کی شخصیت اور ان کے فن پاروں سے متعلق بھرپور روشنی ڈالی ہے اور انہیں علوم فنون کا نادر خزینہ قرار دیا ہے وہ لکھتے ہیں۔:

''ہمارے عہد کی کسی ایسی شخصیت کا انتخاب کرنے کے لئے اگر ہم سے کہا جائے جس نے علم و ادب کی دنیا میں عین حیات ہی میں وقیع و عظیم مقام حاصل کرلیا ہوتو اس ایک قابل فخر اور قابل احترام شخصیت کا نام یقیناً گوپی چند نارنگ ہوگا۔ جی ہاں! گوپی چند نارنگ علوم وفنون کی دنیا کا ایک ایسا محترم نام ہے جس کی ذات سے غیر معمولی فکر ونظر کے نقشِ ہائے رنگ رنگ کی جلوہ سامانیوں کا اعتبار قائم ہے جس کے علمی و تحقیقی اور ادبی و لسانی کارناموں کا دائرہ اس قدر وسیع ہے کہ جس پر فخر نہ کرنا بددیانتی نامعقولیت اور کج فہمی کی کھلی دلیل ہے۔ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ ہمارے درمیان گوپی چند نارنگ جیسا ذی ادراک اور ذی شعور انسان موجود ہے۔

میں اس بات کو اکثر بڑے فخر و امتیاز اور انبساط و ابتہاج کے ساتھ کہا کرتا ہوں کہ میری زندگی علم و ادب کے ارباب کمال کے درمیان گزری ہے دارالمصنّفین اعظم گڈھ کے بلند نگاہ اور اعلیٰ ظرف مصنّفین اور اہل قلم سے لے کر عروس البلاد ممبئی کے تاجورانِ شعر وادب تک کے بیشتر قد آور شعرا اور ماہرین نقد وادب کی مقالہ خوانیوں اور بلیغ اور پرفکر تقاریر سے لطف اندوز ہوا ہوں لیکن مجھے اس بات کا اعتراف کرلینے میں ذرا بھی پس و پیش نہیں کہ جناب گوپی چند نارنگ کی مقالہ خوانی اور تقاریر میں موضوعات کی افہام و تفہیم اور ادبی سخن پذیری کا جو طریقہ دلنواز میں نے دیکھا اور محسوس کیا اس کی مثالیں میرے سامنے بہت کم ہیں ایسا میں نے کبھی دیکھا ہی نہیں کہ گوپی چند نارنگ ادب وثقافت کے پلیٹ فارم سے

کسی گہرے اور گمبھیر موضوع پر تقریر کر رہے ہوں یا کوئی مقالہ پڑھ رہے ہوں اور ان کی تقریر اور مقالہ خورانی کے دوران ان کے سامعین اور مخاطبین مسحور اور حیرت زدہ نہ ہوئے ہوں۔ گوپی چند نارنگ صاحب کا یہ وصف قابل لحاظ ہے کہ اپنی تقریر اور تحریر میں وہ موضوع کے ساتھ پورا انصاف کرتے ہیں۔ تحلیل و تجزیہ اور مقابلہ و محاکمہ کا ان کا طریقہ اتنا واضح اور غیر جانبدار ہوتا ہے کہ زبان سے داد و تحسین کے کلمات کی ادائیگی ضروری ہو جاتی ہے۔ علم و ادب کی دنیا میں مکاری، زمانہ سازی اور منافقت کی بیماری جڑ پکڑ رہی ہے، اچھے اچھوں کے خیالات و نظریات نامعقولیت اور مشتبہ چال چلن کے حامل ہوتے جا رہے ہیں لیکن ایسے نامساعد حالات میں بھی گوپی چند نارنگ کا ذہن ہر طرح کی کج رویوں سے محفوظ ہے۔ اپنی تحریروں اور تقریروں میں انہوں نے حق و انصاف توازن و اعتدال اور شائستگی کی روشنی میں اختیار کی ہے۔ ان کی گل فشانی گفتار ان کی بلند نگاہی اور وسیع النظری کے پیش نظر اور دل پذیر ہو جایا کرتی ہے۔ زندہ دلی ان کی زندگی کا وہ طریقہ ہے جو بادی النظر ہی میں محسوس کیا جا سکتا ہے۔''

محمد ایوب واقف نے اپنے اس مضمون میں پروفیسر گوپی چند نارنگ کی شخصیت اور ان کی تنقید نگاری اور اردو میں عالمی خدمات کا بھرپور جائزہ لیا ہے۔ اس طرح کے درجنوں مضامین پروفیسر گوپی چند نارنگ کی تنقید نگاری اور ان کی شخصیت اور دیگر ادبی کارناموں پر کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں اور اردو کے کئی رسالوں کے خصوصی نمبر مثلاً شہزاد انجم کی مرتب کردہ کتاب ''دیدہ ور نقاد'' جو سینکڑوں صفحات پر مشتمل ہے جس میں دنیا بھر کے تمام نقادوں شاعروں ادیبوں نے ان کی علمیت قابلیت ان کی تنقید نگاری اور ادبی

خدمات کا اعتراف کیا ہے۔ اسی طرح ''گوپی چند نارنگ حیات اور خدمات'' میں ڈاکٹر حامد علی خاں نے ان کی تمام زندگی اور شخصیت کا ان کی ادبی خدمات کا بھرپور جائزہ لیا ہے۔ ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی نے ''گوپی چند نارنگ اور ادبی نظریہ سازی'' کے عنوان سے کتاب لکھی ہے جس میں نارنگ صاحب کی تنقید نگاری اور ان کے نظریات سے بحث کرتے ہوئے نارنگ صاحب کی منفرد تحریروں کا احاطہ کیا گیا ہے اور کھل کر گفتگو کی گئی ہے۔ اسی طرح عبدالمنان طرزی نے نارنگ زار کے عنوان سے پروفیسر نارنگ کی پوری ادبی زندگی، شخصیت، تنقید نگاری اور ان کی دیگر تحریروں اور کارناموں کا منظوم ترجمہ سینکڑوں اشعار پر مشتمل کر کے ایک بہت ہی بڑا کارنامہ انجام دیا ہے کہ جس میں نارنگ صاحب کی ایک ایک بات اور ایک ایک پہلو کا ایک ایک شعر میں جائزہ لے کر ادبی دنیا میں بھی ایک منفرد ریکارڈ قائم کیا ہے ایسی کتابیں آج تک دیکھنے میں نہیں آئیں۔ ہم نے اردو مثنویاں ضرور پڑھی ہیں جس میں ہزار ہزار اشعار پر مشتمل عشقیہ داستانوں کو منظوم کیا گیا ہے لیکن کسی زندہ جاوید اور عظیم شخصیت پر یہ پہلی منفرد دستاویزی کتاب ہے جو سینکڑوں اشعار پر مشتمل ایک انوکھا منفرد کارنامہ ہے جہاں ایک طرف درجنوں مصنفوں نے پروفیسر نارنگ کی شخصیت اور ان کی دیگر تحریروں پر الگ الگ عنوانات سے کتابیں لکھی ہیں تب جا کر ان کے تمام کارناموں کا احاطہ کیا گیا ہے لیکن عبدالمنان طرزی کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے ایک ایک شعر میں نارنگ کی شخصیت کا خاکہ کھینچ کر سلسلہ وار ایک مثنوی کی شکل میں ایک سچی تاریخ لکھ ڈالی اسی طرح نارنگ صاحب پر ایک درجن سے زیادہ ادبی رسالوں نے خصوصی نمبر شائع کئے۔ 1997 میں 'الفاظ' علی گڈھ نے گوپی چند نارنگ نمبر شائع کیا، 1995 میں کتاب نما کا خصوصی نمبر شائع ہوا، اسی طرح پہچان الہ آباد، چہار سو راولپنڈی، اسباق پونہ کے علاوہ کئی ادبی رسالوں نے خصوصی گوشے شائع کئے۔ سچائی تو یہ ہے کہ پروفیسر نارنگ پر اتنا کچھ لکھا جانے کے باوجود اب بھی بہت کچھ باقی ہے۔ بہت سے ایسے گوشے ان کی شخصیت، ان کی تنقید نگاری اور دیگر ادبی خدمات

کے ہیں جن پر بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے لکھا جانا چاہئے اور لکھا جا رہا ہے جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ میرا یہ مختصر مقالہ صرف ان کی چند کتابوں کی روشنی میں لکھا گیا ہے یہ کوئی مسلسل یا پلاننگ کے ساتھ کام نہیں کیا گیا ہے بلکہ چند کتابوں پر تبصرہ کرتے کرتے بات کو پھیلا دیا گیا ہے، امید ہے قارئین میری یہ حقیری کوشش قبول فرمائیں گے۔

''ما بعد جدیدیت اور پروفیسر گوپی چند نارنگ''

پروفیسر گوپی چند نارنگ نے پچھلے چند سالوں میں اپنی تمام زندگی کے بکھرے ہوئے کاموں کو سمیٹ کر جو کتابیں ترتیب دی ہیں یا ابھی تک غیر مطبوعہ تھیں وہ ساری کی ساری تحریریں اور دیگر مضامین پچھلے دو تین سال میں جو کتابی شکل میں شائع ہوئی ہیں وہ ادبی دنیا کے لئے ایک قیمتی سرمائے کی حیثیت رکھتی ہیں ان کی کچھ پچھلی کتابوں پر میں پہلے ہی اظہار خیال کر چکا ہوں۔ پروفیسر نارنگ نے اتنا کچھ لکھا ہے کہ میں تمام عمر بھی پڑھنا چاہوں تو نہیں پڑھ سکتا اس کے لئے ایک طویل عمر درکار ہوگی اسی لئے میں اپنے یہ مختلف کتابوں پر لکھے ہوئے مضامین کو کتابی شکل میں شائع کرنے کی کوشش کروں گا یوں تو ان کی چار پانچ کتابیں جو میرے زیر مطالعہ رہی ہیں وہ اتنی اہم اور ایسے موضوعات پر ہیں کہ جن کی تفصیل میں جانا ممکن نہیں ہے ان کی اکثر کتابوں میں اکثر مضامین کا انحصار ایک خاص موضوع پر رہا ہے یہ ان کی اپنی ذاتی کوششوں کا نتیجہ ہے وہ ہے مابعد جدیدیت یعنی جدیدیت کے بعد بس یہی موضوع ایک ایسا ہے جس نے ساری ادبی دنیا کو اپنی طرف متوجہ کرلیا ہے یہ مابعد جدیدیت ہی کا کمال ہے جس نے ادب میں چھائے ہوئے جمود کو توڑنے میں ایک تازیانے کا کام کیا ہے اگر ادبی دنیا میں پروفیسر گوپی چند نارنگ جیسے چند دانشور نقاد ہی پیدا ہوجائیں تو اردو زبان اور اردو ادب پر کبھی جمود طاری نہیں ہوسکتا ترقی پسندی کے زوال کے بعد اگر شمس الرحمٰن فاروقی جیسا جید دانشور نقاد پیدا نہ ہوتا تو ادب کا کارواں جانے کس منزل پر جا کر ٹھہرتا۔ لیکن شمس الرحمٰن فاروقی نے جدیدیت کا پرچم لہرا کر ساری ادبی دنیا کو اپنی طرف کھینچ لیا لیکن سوال

یہ پیدا ہوتا ہے کہ کوئی بھی تحریک ہو کوئی بھی نظریہ ہو کوئی رجحان ہو وہ ہمیشہ قائم نہیں رہتا ہر تحریک اپنا کام پورا کرنے کے بعد دم توڑ دیتی ہے ترقی پسند تحریک سے منسلک ادیبوں اور شاعروں نے بہترین ادب تخلیق کیا افسانہ، ناول، نظم، غرض یہ کہ ادب کی تمام اصناف میں ترقی پسندوں نے خوب تخلیقی جوہر دکھائے۔ آج ترقی پسندی کے دور میں لکھے ہوئے افسانے، ناول اردو ادب کا قیمتی سرمایہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ لیکن کسی بھی چیز کی کثرت اور بہتات کسی بھی ادب کے لئے سوائے نقصان کے فائدہ مند نہیں ہوسکتی۔ ترقی پسندوں نے یا اس تحریک سے منسلک لکھنے والوں نے جب اپنے نظریے کو زبردستی اپنے قاری پر تھوپنے کی کوشش کی اور چند بندھے ٹکے موضوعات کو ہی سب کچھ سمجھ لیا تو اس تحریک نے بھی دم توڑ دیا یعنی یہ تحریک اپنا پورا رول ادا کرنے کے بعد اپنے انجام کو پہنچ گئی اور جدیدیت کا سنہری دور آیا جس کے بانی اور علمبردار شمس الرحمٰن فاروقی کہلائے۔ بیس پچیس سال جدیدیت بھی چھائی رہی اور سارے لکھنے والے جدیدیت سے منسلک ہو گئے لیکن جب فاروقی صاحب اپنے ''شب خون'' کے ذریعہ ادب میں اپنا نظریہ تھوپنے لگے تو جدیدیت بھی رفتہ رفتہ دم توڑنے لگی اور ان دونوں تحریروں سے بیزار نئی نسل اپنی منزل کی تلاش میں کسی ایسی تحریک یا رہنما کی منتظر سارے نقادوں کی طرف دیکھتی رہی اور ہر تحریک سے بیزار صرف اپنی تخلیق پر اعتماد رکھنے والے جنوئن فنکار کسی بھی نقاد کو ماننے کو تیار نہیں ہیں اسی درمیان اس عہد کے دانشور نقاد پروفیسر گوپی چند نارنگ نے مابعد جدیدیت یعنی جدیدیت کے بعد کا اعلان کیا گویا نئی نسل کو ایک راہ مل گئی یہی جدیدیت کے بعد گوپی چند نارنگ کی کتاب اس وقت میرے سامنے ہے۔ اور یہی ہمارا موضوع ہے۔ جدیدیت کے بعد کے موضوع پر پچھلے سالوں میں پروفیسر نارنگ نے بہت کچھ لکھا ہے۔ اپنی تقریروں میں تحریروں میں اور مختلف رسائل میں شائع ہونے والے مضامین میں ان کا یہی موضوع رہا ہے اور جدیدیت کے بعد ان کے مختلف مضامین کو کتابی شکل میں شائع کیا گیا ہے۔ 632 صفحات پر مشتمل یہ کتاب ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی

نے اہتمام سے شائع کی ہے اس سے پہلے کہ اس کتاب پر گفتگو کی جائے یہاں پروفیسر گوپی چند نارنگ کے لکھے ہوئے اس کتاب کے دیباچے سے ایک اقتباس پیش کرنا ضروری سمجھتا ہوں:

"کیمبرج یونیورسٹی کی History of literay Criticism کی ساتویں اور تازہ ترین جلد میں 1950 سے 2000 تک کی مدت کو Age of Criticism کہا گیا ہے یعنی اس نصف صدی میں عالمی سطح پر سب سے زیادہ ترقی تنقید نے کی اور جن ادبی مباحث نے سب کو متاثر کیا وہ تنقید اور تھیوری سے متعلق ہیں۔ اردو میں بھی ادھر کا کچھ زمانہ ادبی تھیوری کے زور دار مباحث اور نئی تبدیلیوں کا ہے، جن میں کسی نہ کسی حد تک میں برابر شریک رہا ہوں۔ ادبی افق پر تاریخی و ذہنی عوامل کی وجہ سے تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ کبھی کوئی رجحان حاوی ہوجاتا ہے کبھی کوئی۔ ایسا دانش انسانی کے کسی دھماکے یا سوچ کی تبدیلیوں کی وجہ سے بھی ہوتا ہے یا کسی بڑے فلسفی یا عظیم ادبی شخصیت کے اثر سے بھی۔ عوامل جو بھی ہوں، ادھر کے برسوں میں سب سے زیادہ مرکز توجہ ادبی تھیوری اور اس سے متعلقہ تنقیدی مباحث رہے ہیں۔ کچھ معاصرین عدم تحفظ کی نفسیات کی وجہ سے اس کے دباؤ میں بھی رہتے ہیں لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ ادبی رویے کسی کے بس کے نہیں ہوتے۔ نتیجتاً اردو میں بھی ادبی منظر نامہ اتنا بدل چکا ہے کہ اب اس سے کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ نئی بصیرتوں کے عام ہونے سے ادبی مطالعہ کے نئے ابعاد سامنے نہیں آئے۔ یوں بھی سابقہ ادبی تحریکیں اپنا تاریخی کردار ادا کرکے بے اثر ہوجاتی ہیں۔

جدیدیت ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے عالمی سطح پر بے اثر ہوگئی اور اردو میں بھی ہر چند کہ تحریکوں کے نام لیوا زندہ رہتے ہیں اور وہ اپنے وجود کا ثبوت دینے کے لئے ان کا جواز بھی پیش کرتے رہتے ہیں، لیکن تحریکوں کا تحرک وقت کے ساتھ ساتھ ختم ہو جاتا ہے۔ اتنی بات سب کو معلوم ہے کہ نہ صرف ہندوستان کی اکثر زبانوں میں جدیدیت نمٹ چکی ہے بلکہ دنیا بھر میں جدیدیت نام کی کوئی تحریک اب باقی نہیں رہی۔ اس کی جگہ جدیدیت کے بعد کے تنقیدی تصورات اور ذہن ونظر کی نئی کشادگی اور تازگی نے لے لی ہے۔ اردو میں بھی ایسا ہی ہوا ہے۔''

پروفیسر گوپی چند نارنگ کے اس اقتباس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ترقی پسندی اور جدیدیت اپنا اپنا رول ادا کر کے ختم ہو چکی ہیں اور جس دور کا آغاز ہوا ہے جن تبدیلیوں کے ہم منتظر تھے وہ تبدیلیوں کا دور مابعد جدیدیت یعنی جدیدیت کے بعد کا دور ہے اور پروفیسر گوپی چند نارنگ کی اس کتاب کا تعلق اسی موضوع سے ہے جدیدیت کے بعد کے دور کا انہوں نے بہت گہرا مطالعہ اور مشاہدہ کیا ہے اور ہندوستان میں جدیدیت کے بعد کے دور کے نہ صرف وہ بانی ہیں بلکہ انہوں نے مابعد جدیدیت کے فروغ میں ایک ایسا کردار ادا کیا ہے کہ مابعد جدیدیت نے ایک تحریک کی شکل اختیار کر لی ہے۔ نارنگ صاحب نے دن رات نہ صرف نئی نسل کی آبیاری کی ہے بلکہ عملی طور پر اپنے مضامین اپنی تقریروں اور تحریروں اور کتابوں سے یہ ثابت کر دیا ہے کہ جدیدیت کے بعد کا دور ادبی ارتقاء کا بہترین دور ہے نئی تبدیلیوں کا دور ہے نیا کچھ کرنے کا دور ہے ادب کو کچھ بنا دینے کا دور ہے یہ بھی بڑا کرشمہ ہے کہ پروفیسر نارنگ نے یہ تمام خوبیاں صلاحیتیں یکجا ہوگئیں ہیں ادب کو کچھ نیا دینے کی ادب میں کچھ نیا پیش کرنے کی اور انہوں نے یہ سب کچھ کیا نارنگ صاحب کی یہ کتاب جدیدیت کے بعد ایسے ہی مضامین

پر مشتمل ہے جن کا تعلق جدیدیت کے بعد سے ہے۔ اس کتاب میں دیباچے کے بعد بورس پاسترناک کا ایک اقتباس دیا گیا ہے اپنے ادب اور نظریات کے بارے میں جو ''شب خون'' سے لیا گیا ہے یہ بہت اہم اقتباس ہے جو نئی تبدیلیوں کو خوش دلی سے قبول کرنے والوں کے لئے تو مشعل راہ ہے لیکن جو اپنی ہٹ پر اڑے رہتے ہیں اور اپنے نظریے میں تبدیلی کو ایک عیب سمجھتے ہیں ایسے لوگ اپنے ہی قاتل نہیں ادب کے بھی قاتل ہوتے ہیں۔ اقتباس پیش کیا جاتا ہے:

> ''میں اس تصور سے تو بالکل تنگ آچکا ہوں کہ مصنف کو ہر قیمت پر کسی ایک نقطہ نگاہ کا وفادار رہنا چاہئے۔ ہمارے گرد و پیش کی زندگی بدل رہی ہے۔ لہٰذا ہمیں بھی اپنا جھکاؤ اسی اعتبار سے تھوڑا بدل لینا چاہئے کم از کم دس سال میں ایک بار تو ایسا ہونا ہی چاہئے۔ کسی ایک نقطہ نگاہ سے چپکے رہنا، ہیروں کی طرح ہر حال میں اس پر قائم رہنا یہ میرے مزاج سے متغائر ہے مجھے اس میں انکساری کی کمی نظر آتی ہے۔ مایا کافسکی نے خودکشی کر لی اسی وجہ سے کہ وہ ان چیزوں کے ساتھ معاملہ نہ کر سکا تھا جو ان کے چاروں طرف اور خود اس کے اندر وجود میں آرہی تھیں۔''
>
> بورس پاسترناک (شب خون 268)

اب اگر ادب میں ایک دانشور نقاد نے نئی تبدیلیوں پر گفتگو کا آغاز کیا ہے اور اس آغاز نے تھوڑے ہی عرصے میں ایک تحریک کی شکل اختیار کر لی ہے تو یہ ادب کے روشن مستقبل کے لئے ایک مشعلِ راہ یقیناً ہے جدیدیت کے بعد اس کتاب میں نارنگ صاحب نے پہلے باب میں شعریات پر گفتگو کرتے ہوئے ''مابعد جدیدیت عالمی تناظر میں'' اس مضمون پر نارنگ صاحب نے پورے ادبی منظرنامے پر تھیوری سے بحث کرتے ہوئے مابعد جدیدیت سے متعلق جدید معاشرے میں تبدیل ہونے والے حالات،

مسائل اور ذہنی رویوں سے بحث کی ہے اور سارا زور اس بات پر دیا ہے کہ جب دنیا کے ہر شعبے میں تبدیلیاں رونما ہوچکی ہیں سائنس کی ترقیات اور برقیاتی ٹکنیکی تبدیلیوں نے انسان کو بھی ایک مشین بنا کر رکھ دیا ہے نئے نئے تجارتی طریقے ایجاد ہوگئے ہیں میڈیا نے چاروں طرف شکنجہ کس لیا ہے ایک پل میں نارنگ صاحب کا ایک جملہ ساری دنیا میں پہنچ جاتا ہے، جب اس قدر تبدیلیاں دنیا کے ہر شعبہ ہر زبان میں ہوچکی ہیں ادب بھی کہیں سے کہیں پہنچ گیا ہے اب وہ منشی پریم چند والا کسان نہیں رہا ہے، اب ہلکو کو ایک کمبل خریدنے کے لئے اپنا کلیجہ نکالنے کی ضرورت نہیں پڑتی، سائنس کی اس ترقی نے ہلکو جیسے غریب کسان کو بھی مشینوں کے ذریعہ نئی ٹیکنالوجی، نئے آلات کے ذریعہ اپنی مختصر سی زمین میں زیادہ سے زیادہ اناج پیدا کرنے کا سلیقہ سکھا دیا ہے، تو پھر منشی پریم چند کا وہ افسانہ آج کے افسانے سے کتنا تبدیل ہوگیا، یہی بات ہر فیلڈ میں نظر آتی ہے چاہے وہ ادب کی دنیا ہو یا ہمارا معاشرہ ہو، اب نہ وہ جگر مرادآبادی کی غزل رہی نہ منشی پریم چند والا افسانہ رہا، نہ شراب و شباب کی باتیں شاعری میں رہیں نہ افسانوں میں الف لیلہ جیسی کشش رہی، اس لئے کہ زندگی میں ہی وہ کڑواہٹ پیدا ہوگئی ہے معاشرہ میں اتنی تبدیلیاں ہوچکی ہیں کہ سال بھر کا سفر آج کا انسان چند گھنٹوں میں کر لیتا ہے۔ غالبؔ جب کوئی غزل کہتے تھے تو کئی سال کے بعد وہ غزل دہلی سے بھوپال تک آتی تھی، آج بشیر بدر لال قلعہ سے ایک شعر کہتے ہیں اور چند منٹوں میں وہ ساری دنیا میں پہنچ جاتا ہے، یہی وہ ساری تبدیلیاں ہیں جو ادب میں دکھائی دینے لگیں اور پروفیسر گوپی چند نارنگ نے ان تبدیلیوں کا استقبال کیا اور مابعد جدیدیت کی داغ بیل ڈالی یعنی جدیدیت کے بعد اس کتاب کے پہلے مضمون میں انہی تبدیلیوں کا ذکر کیا گیا ہے پہلے عالمی تناظر میں مغربی مفکروں کے حوالے سے گفتگو کی گئی ہے کہ مابعد جدیدیت کب وجود میں آئی اور کس کس نے کیا کیا لکھا اور ان تبدیلیوں میں مابعد جدیدیت ہندوستان میں

کب آئی اردو کے تناظر میں گفتگو کی گئی ہے اور جدیدیت کے بعد لکھا جانے والا ادب مابعد جدیدیت کی فہرست میں آتا ہے اور ہندوستان میں مابعد جدیدیت کے بانی کی حیثیت صرف نارنگ صاحب کا نام ہی صفحہ اول پر رہے گا اور ہے۔ تیسرے مضمون میں نارنگ صاحب نے ترقی پسند جدیدیت اور مابعد جدیدیت پر تفصیل سے گفتگو کی ہے اس مضمون میں ادب کا پورا پس منظر سامنے آجاتا ہے کہ کیوں ترقی پسندی پر زوال آیا اور جدیدیت کا سنہری دور آیا پھر اس پر بھی زوال آیا کیونکہ ہر تحریک بیس پچیس سال میں اپنا رول ادا کر کے زوال پذیر ہوئی اور ہونا ہی چاہئے کیونکہ تبدیلی کا نام ہی ترقی پسندی ہے جدیدیت ہے اور مابعد جدیدیت ہے اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہر دس بیس سال میں زبردستی ایک نئی تحریک شروع کردی جائے بلکہ تبدیلی ناگزیر ہے۔ وہ ہوتی ہی ہے اس کا استقبال باشعور لوگ ہی کرتے ہیں وقت کا تقاضا زندگی کے مسائل معاشرتی تبدیلیوں سے ہی ادب میں بھی تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں ترقی پسندی اور جدیدیت اپنا اپنا کام کر کے ختم ہوچکی ہیں اور مابعد جدیدیت کے دور کا آغاز نہ صرف ہوچکا ہے بلکہ جدیدیت کے بعد لکھا جانے والا سب کچھ اب مابعد جدیدیت کے زمرے میں شامل کیا جائے گا لیکن یہ بات ذہن میں رہنا چاہئے کہ روایت کی پاس داری روایت کا احترام سب پر یقیناً لازمی ہے۔ لیکن روایت کا غلام ہونا نہ ترقی پسندی ہے نہ جدیدیت ہے نہ مابعد جدیدیت سے اس کا کچھ تعلق۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ نے اس کتاب میں اسی طرح کے ایسے ایسے مضامین شامل کئے ہیں جن کا تعلق جدیدیت کے بعد سے ہے جنریشن گیپ سے ہے اور ان کی ساری گفتگو ان جنوئن فنکاروں اور کشادہ ذہن نوجوانوں سے ہے جن کے یہاں تخلیقی امکانات بھی ہیں اور آگے بڑھنے کا جذبہ بھی ہے۔

جدیدیت کے بعد سے متعلق پروفیسر نارنگ لکھتے ہیں:

> ''یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ جس طرح ترقی پسندی دقیانوسیت کی ضد
> تھی یا جدیدیت اور ترقی پسندی سیاسی اور غیر سیاسی ایجنڈے کی

بناء پر ایک دوسرے کی ضد تھیں۔ مابعد جدیدیت، جدیدیت کی
ضد نہیں ہے۔ یہ دونوں سابقہ تحریکوں کی طرح
Diametrically opposed نہیں ہیں۔ مابعد
جدیدیت بلاشبہ جدیدیت سے الگ بھی ہے اور اس سے انحراف
بھی ہے لیکن اس میں لاحقہ مابعد بے مصرف نہیں، یعنی زمانی اعتبار
سے مابعد جدیدیت، جدیدیت کے بعد بھی ہے اور اس سے الگ
بھی ہے۔ الگ اس معنی سے کہ اس کی ترجیحات کا انحراف اس کی
حاوی ترجیحات سے ہے۔ گویا اس کے فلسفیانہ قضایا اس کے
فلسفیانہ قضایا سے نمو کرتے ہیں اور اس کو سمجھنے کے لئے سابق کے
قضایا کا حوالہ ضروری ہے۔ دوسرے لفظوں میں مابعد جدیدیت کی
متعدد انحرافی ترجیحات جدیدیت کی ترجیحات کی ارتفاعی صورت
ہیں۔ یعنی ضروری نہیں کہ ہر ہر نکتے سے اختلاف کیا گیا ہو۔ لیکن
جن نکات سے اختلاف و انحراف کیا گیا ہے وہ اس درجہ بنیادی
ہے کہ مابعد جدیدیت کا نظریاتی کردار جدیدیت سے الگ قرار
پاجاتا ہے۔"

اس اقتباس میں نارنگ صاحب نے واضح کردیا ہے کہ مابعد جدیدیت نہ تو جدیدیت کی ضد ہے اور نہ مابعد جدیدیت کا نظریاتی کردار جدیدیت سے الگ قرار پاجاتا ہے، یعنی جس طرح ترقی پسندی پر نظریات حاوی ہوگئے تھے اور ایک مقصد کے تحت لکھا جانے والا ادب ترقی پسندی کہلایا اسی طرح جدیدیت جو کہ ترقی پسندی کی ضد نہیں بلکہ وقت کا تقاضا اور بندھے ٹکے موضوعات سے چھٹکارا حاصل کرنے کا ایک کامیاب تجربہ کہنا چاہئے جسے زبردستی تحریک کی شکل دیدی گئی ہے اور اس میں بھی نظریات حاوی ہوگئے مابعد جدیدیت کا کام نہ ترقی پسندی سے دشمنی ہے نہ جدیدیت

سے انحراف بلکہ مابعد جدیدیت تو وہ ہے جو کسی بھی نظریات پر کسی بھی تحریک پر نہیں چلتی بلکہ ایک کھلے ذہن اور کھلی فضا میں سانس لینے کا نام مابعد جدیدیت ہے جس پہ اظہار کی پابندیاں عائد نہیں کی جاسکتیں اور جدیدیت کے بعد نئی نسل نے خواہ وہ فکشن ہو یا شاعری ہو ادب سے متعلق کوئی بھی صنف ہو ہر لکھنے والا اپنے بھرپور کھل کر اظہار کے لئے آزاد ہے۔ یہی آزادی مابعد جدیدیت ہے پروفیسر گوپی چند نارنگ نے ہی نہیں دنیا کے تمام بڑے نقادوں نے اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ ادب میں وہ شاہکار تخلیق وہ شاہکار فن پارہ ہو ہی نہیں سکتا جس میں لکھنے والے کو اظہار کی آزادی نہ ہو پروفیسر نارنگ کی اس کتاب میں یعنی جدیدیت کے بعد سارے مضامین میں اسی بات پر زور دیا گیا ہے جیسے کتاب کی فہرست پر ایک نظر ڈالتے ہیں شعریات سے متعلق جن مضامین کی فہرست دی گئی ہے ان میں:

۱- مابعد جدیدیت عالمی تناظر میں
۲- مابعد جدیدیت اردو کے تناظر میں
۳- ترقی پسندی، جدیدیت، مابعد جدیدیت
۴- مابعد جدیدیت کے حوالے سے کشادہ ذہنوں اور نوجوانوں سے کچھ باتیں
۵- کیا آگے راستہ بند ہے
۶- مابعد جدیدیت کچھ روشن زاویے
۷- تاریخیت اور نئی تاریخیت
۸- جدید نظم کی شعریات پر ایک نظر کیا ادبی قدر بے تعلق معنی ہے
۹- جدید نظم کی شعریات اور کہانی کا عنصر
۱۰- کیا تنقید کی بدلتی ترجیحات اور رویے ہمیشہ نظریاتی اور اقداری نہیں ہوتے
۱۱- اکتشافی تنقید کی شعریات پر کچھ باتیں.

اس کتاب کے دوسرے باب شاعری سے متعلق پروفیسر نارنگ نے مختلف

شاعروں پر مضامین تحریر کیے اور مختلف اوقات میں چھپے مضامین کو یکجا کیا ہے۔ مثلاً ہندوستانی فکر و فلسفہ اور اردو غزل، زبان کے ساتھ کبیر کا جادوئی برتاؤ، انیسؔ کی معجز بیانی، تہذیبی جہات، فیض کو کیسے نہ پڑھیں، عالی جی کے من کی آگ، جمیل الدین عالی اور آٹھویں سر کی جستجو، محمد علوی کی شاعری اور احساس کا دوسرا پن۔ 632 صفحات پر مشتمل یہ کتاب نئے لکھنے والوں کے لئے بہترین مواد فراہم کرتی ہے اس کتاب میں جدیدیت کے بعد لکھی جانے والی تحریروں کے علاوہ دیگر ذاتی شخصیات اور مختلف موضوعات پر بھی مضامین شامل ہیں۔ جس پر آئندہ گفتگو کی جائے گی۔

آگے اب پروفیسر گوپی چند نارنگ کی ان اہم کتابوں پر نظر ڈالتے ہیں جو ان کی تمام عمر کی محنت اور تحقیقی کاوشوں کا نتیجہ ہیں، مثلاً اردو مثنویاں، اردو غزل اور ہندوستانی ذہن و تہذیب۔

ہندوستانی قصوں سے ماخوذ اردو مثنویاں

از پروفیسر گوپی چند نارنگ

پروفیسر گوپی چند نارنگ اردو ادب کی ان نامور ہستیوں میں سے ایک ہیں جن کے ادبی کارناموں سے اردو ادب کی تاریخ روشن ہے۔ ان کے ادبی کارناموں سے ساری ادبی دنیا نہ صرف واقف ہے بلکہ ان کے تمام کارناموں کا احاطہ کرنا بھی مشکل ہے۔ یوں تو انھوں نے اتنا کچھ لکھا ہے، ایسے ایسے موضوعات پر لکھا ہے کہ الگ الگ موضوعات پر مختصر مختصر ہی روشنی ڈالی جائے یا تذکرہ ہی کیا جائے تو ایک ضخیم کتاب ہو جائے اور بہت سے لکھنے والوں نے ان پر کام بھی کیا ہے اور کیا جا رہا ہے۔ دوسرے یہ کہ آج بیرونی ممالک میں یعنی اردو کی نئی بستیوں میں جو اردو کی چہل پہل دکھائی دے رہی ہے، سیمینار ہو رہے ہیں، مشاعرے ہو رہے ہیں، اردو رسالے نکل رہے ہیں، اخبارات شائع ہو رہے ہیں، اس کا کریڈٹ بھی نارنگ صاحب کو جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آج علمی پیمانے پر جو سیمینار ہو رہے ہیں ان میں جگن ناتھ آزاد اور نارنگ صاحب کی تقریروں کا ہی نتیجہ ہے کہ آج ساری دنیا اس طرف راغب ہوگئی ہے، حالانکہ یہ موضوع الگ ہے لیکن ہم اس محسن اردو کے کارناموں کی وجہ سے ہی تو آج بیرونی ممالک کے سیمیناروں میں شرکت کرنے کو کیسے بھلا سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج سعودی عرب میں امریکہ میں نہ صرف ان کے جشن منائے جا رہے ہیں بلکہ ان کی ادبی خدمات کے صلے میں انھیں ایوارڈ دیئے جا رہے ہیں لیکن اس وقت میرے سامنے ان کا

ایک عظیم کارنامہ ہندوستانی قصوں سے ماخوذ اردو مثنویاں ہیں۔ یہ کتاب نارنگ صاحب کا ایک ایسا کارنامہ ہے جو اردو زبان ادب میں نہ صرف ایک اضافہ ہے بلکہ ایک نایاب قیمتی تحفہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ ہندوستانی قصوں پر مشتمل ایسی تمام مثنویوں کو نہ صرف ایک جگہ جمع کر دیا گیا ہے بلکہ ان پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے جسے قومی کونسل نے اہتمام کے ساتھ شائع کیا ہے۔ اس کتاب میں اردو کی مشہور مثنویوں کے علاوہ ایسی بہت سی مثنویوں کا بھی ذکر کیا ہے جو اردو والوں کے لئے نئی ہیں۔ جن سے عام اردو والے تو واقف ہی نہیں تھے۔ دراصل پروفیسر گوپی چند نارنگ ماہر لسانیات اور ایک بڑے نقاد ہونے کے ساتھ ساتھ فارسی انگریزی ادب کا اتنا گہرا مطالعہ رکھتے ہیں کہ فارسی مثنویوں کے حوالوں اور ان کے مطالعہ کی روشنی میں ہندوستان کی پوری تہذیب، پورا سیاسی سماجی، علمی، ادبی پس منظر بیان کرتے ہوئے مکمل تاریخ دہرادی ہے۔ ایک بڑی عمر اس تحقیقی کام میں گزارنے کے بعد قلم اٹھایا ہے۔ قدیم لوک کہانیوں سے اردو کی مشہور مثنویوں کے حوالے سے اس طرح تاریخی سیاسی، سماجی پس منظر کو واضح کر دیا ہے جیسے ہم اردو مثنویوں کا مطالعہ نہیں بلکہ ہندوستان کی تاریخ، ہندوستان کی تہذیب کا مطالعہ کر رہے ہوں۔ مثنوی کدم راؤ پدم راؤ، طوطی نامہ، قصہ طوطہ نامہ سے ملتی جلتی دوسری درجنوں مثنویوں کا ذکر بھی اس کتاب میں کیا گیا ہے۔ جس سے کتاب کی اہمیت اور افادیت میں اور بھی اضافہ ہوتا ہے۔ اس کتاب کو پڑھتے ہوئے لگتا ہے کہ نارنگ صاحب نے تمام عمر صرف مثنویوں کی کھوج میں صرف کی ہے۔ زندگی کی تمام تر مصروفیات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے صرف ہندوستانی قصوں کی تلاش میں بستی بستی گاؤں گاؤں شکنتلا، نجم النساء کو ڈھونڈتے رہے ہوں اور ایک عمر کی کھوج کے بعد یہ کتاب ہندوستانی قصوں سے ماخوذ اردو مثنویاں مکمل کی ہو۔ اس لئے کہ اس کتاب میں کوئی ایسی مثنوی نہیں جس کا ذکر نہ کیا ہو۔ باب اول میں قدیم لوک کہانیوں کے علاوہ دکھنی مثنویاں بھی تلاش کی ہیں، ان پر نظر ڈالتے ہوئے کتاب میں سب سے پہلے ایک ایسا مقدمہ تحریر کیا ہے جس کے مطالعے کے

بعد ان مثنویوں کا مطالعہ کیا جائے تو اور بھی تاریخ کی کڑیاں کھلتی چلی جاتی ہیں، اس لئے
کہ مقدمہ لکھتے ہوئے تحقیق کی رفتار پر بھی گہری نظر ڈالی گئی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''اردو میں تحقیق کی موجودہ رفتار کو دیکھتے ہوئے یہ بات افسوس
ناک ہے کہ اردو مثنویوں پر ابھی تک کوئی خاطر خواہ کام نہیں ہوا۔
غزل کے بعد ہمارے شاعروں نے جس صنف سخن پر سب سے
زیادہ طبع آزمائی کی وہ مثنوی ہی ہے۔ غزل پر تو ان چند برسوں
میں دفتر کے دفتر سیاہ کر دیئے گئے ہیں لیکن مثنوی کا کوئی پرسان
حال نہیں۔ امیر احمد علوی نے مثنویات پر ایک مقالہ ۱۹۳۵ء میں
نگار کے لئے لکھا تھا، یہی بعد میں کتابی صورت میں شائع کر دیا
گیا۔ عبدالقادر سروری کی کتاب اردو مثنوی کا ارتقاء بھی تقریباً بیس
برس پہلے لکھی گئی تھی۔ جلال الدین جعفری کی کتاب تاریخ
مثنویات اردو کے نام سے دو بار شائع ہو چکی ہے لیکن اس کی
نوعیت تاریخی اور تحقیقی نہیں۔ اس میں زیادہ توجہ مشہور اردو مثنویوں
کا انتخاب پیش کرنے میں صرف کی گئی ہے۔''

سچائی یہی ہے کہ اردو مثنویوں پر کوئی مکمل جامع کام ابھی تک نہیں ہوا تھا۔
اس لحاظ سے دیکھا جائے تو پروفیسر گوپی چند نارنگ صاحب کا یہ سب سے بڑا کارنامہ
ہے کہ انھوں نے اردو مثنویوں کی پوری تاریخ کو پیش کر دیا ہے۔ یہ کتاب دراصل اردو
مثنویوں پر ہی نہیں ہے بلکہ سینکڑوں برس کا پورا تاریخی، سیاسی، سماجی پس منظر بھی ہے۔
اس زمانے کی بول چال، رہن سہن، طور طریقے، لباس ایک دوسرے پر قربانی کا جذبہ،
آن بان شان، جنگ ہتھیار، عشق و محبت، کیا کچھ نہیں ہے۔ اس کتاب کی تیاری میں
نارنگ صاحب نے کتنی کتابوں کا مطالعہ کیا ہوگا، کتنی لائبریریز کھنگالی ہوں گی، کتنے
نایاب قلمی اور طبع شدہ نسخوں کو پڑھا ہوگا۔ ایک تو موضوع ہی مشکل دوسرے مکمل تحقیق

اور عرق ریزی کے ساتھ سینکڑوں مثنویوں کا مطالعہ پھر ان پر تاریخی حوالے، سیاسی سماجی پس منظر کی عکاسی کرتے ہوئے نوٹ لکھنا، یہ سب کچھ پڑھتے ہوئے یہ بات تسلیم کرنا پڑتی ہے کہ پروفیسر نارنگ صاحب ایک عظیم محقق ہی نہیں بلکہ ایک دانشور بھی ہیں، یہی وجہ یہ کہ اس کتاب میں انھوں نے زندگی کے کئی برس صرف کئے ہیں تب کہیں جا کر اردو دنیا کے سامنے ایسی ضخیم اور نایاب مثنویوں کو بھی کھوج نکالا ہے جن پر ابھی تک کسی محقق کی نظر نہیں گئی تھی، دکھنی مثنویوں کا حوالہ دیتے ہوئے انھوں نے پورے دکھنی ادب کو کھنگال ڈالا ہے، ان کے اس زبردست کام پر دنیا کے تمام بڑے محققین نے نہ صرف مبارکباد دی ہے بلکہ اردو تحقیق میں ان کے اس کارنامے کو ایک بڑا اضافہ قرار دیا ہے۔ امتیاز علی عرشی، قاضی عبدالودود، مسعود حسن رضوی ادیب، مولانا ضیا احمد بدایونی سے لے کر نیاز فتحپوری، احتشام حسین، آل احمد سرور، گیان چند جین وغیرہ نے نارنگ صاحب کے اس کارنامے کو عظیم کارنامہ قرار دیا ہے۔ سید احتشام حسین لکھتے ہیں:

> ''موضوع کی حد بندی اور تہذیبی اہمیت نے ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کی زیر نظر کتاب کو امتیازی حیثیت دے دی ہے۔ کیونکہ اس وقت تک اردو مثنویوں کا یہ پہلو نگاہوں سے اوجھل تھا۔ ڈاکٹر نارنگ اردو کے محققوں میں اپنا ایک مقام بنا چکے ہیں۔ ان کی اس کتاب نے ادبی مطالعہ کے ایک نئے زاویہ کی طرف اشارہ کیا ہے کہ شعر و ادب ملکی تہذیب کی پوری تصویر بنانے میں مدد دیتے ہیں۔ ڈاکٹر نارنگ کی سعی و جستجو سے اس مطالعہ کے لئے زمین ہموار ہوگئی ہے۔''

پروفیسر گوپی چند نارنگ صاحب کے اس کارنامے کو دیکھ کر اردو کے تمام محققین اس بات پر متفق ہیں کہ اس سے بڑا کارنامہ اس موضوع پر ابھی تک کسی اور محقق نے انجام نہیں دیا۔ آل احمد سرور نے لکھا ہے:

''ہندوستانی قصوں سے ماخوذ اردو مثنویاں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کا کارنامہ ہے، اردو مثنویوں میں جو فضا اور ماحول ہے اس کی طرف ابھی تک بہت کم توجہ کی گئی ہے۔ ڈاکٹر نارنگ نے اس کمی کو دور کرنے کی پوری کوشش کی ہے اور نہایت تلاش و تحقیق سے اردو مثنویوں کی ہندوستانی بنیاد کا جائزہ لیا ہے۔ نارنگ جس موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں اس کے سارے گوشوں پر نظر رکھتے ہیں۔ انھوں نے تحقیق کے ...... کو جو نظروں سے اوجھل تھے یکجا کر کے ایک داستان مرتب کی ہے جس میں معلومات کے ساتھ دلکشی بھی ہے۔''

پروفیسر نارنگ کا مطالعہ بہت وسیع ہے، فارسی ادب کے گہرے مطالعہ کی وجہ سے اردو مثنویوں پر ایسے مکمل جامع کام کو پایہ تکمیل تک پہنچانے میں انھوں نے مثنویوں سے متعلق معمولی معمولی واقعات اور مثنویوں کی تخلیقی وجوہات پر بھی بحث کرتے ہوئے ایک مورخ کا کام بھی کیا ہے۔یعنی اس کتاب کو پڑھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ ہم اردو شاعری کا لطف ہی حاصل نہیں کر رہے ہیں بلکہ ہندوستان کی تہذیب کا مطالعہ کر رہے ہیں۔ سینکڑوں برس پرانی تہذیب کا تاریخی، سیاسی، سماجی پس منظر کا مطالعہ کر رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ہندوستانی قصوں میں لوک کہانیاں سنسکرت فارسی کے ادبی شہ پاروں کی جھلکیاں ہمیں اردو کی ان مثنویوں میں صاف صاف دکھائی دیتی ہیں جن پر نارنگ صاحب نے اشارے کئے ہیں۔ ہندوستانی ادب میں سنسکرت فارسی میں اتنا کچھ لکھا گیا ہے کہ وہ سب اگر اردو میں آجائے تو دنیا کے کسی زبان کا ادب اس کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ ایسے ایسے نایاب تخلیقی نمونے موجود ہیں انہیں میں سے ایک نایاب قیمتی سرمایہ کو نارنگ صاحب نے اس کتاب میں پیش کیا ہے۔ مثنوی گلشن عشق، ظفر نامہ، سندر سنگار، سنگھاسن بتیی، ویربکرم، ہیررانجھا، چھومنتر، کرشن کنور، قطب مشتری، سے لے کر درجنوں ایسی

مثنویوں کا تفصیل سے ذکر کیا ہے جنھیں ہم جیسے اردو والوں نے پڑھنا تو دور کی بات ہے نام تک نہیں سنے۔ اس پر ہندی سنسکرت، انگریزی، فارسی کے حوالوں نے اس کتاب کی اہمیت اور افادیت میں اور بھی اضافہ کر دیا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ان پر سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے۔ بلاشبہ نارنگ صاحب کا یہ ادبی کارنامہ اردو زبان و ادب کے لئے ایک ایسا اضافہ، ایسا قیمتی سرمایہ ہے جس پر ساری اردو دنیا کو فخر ہے۔

☆☆☆☆

ہندوستان کی تحریک آزادی اور اردو شاعری

از گوپی چند نارنگ

ایک سال کے اندر پروفیسر گوپی چند نارنگ کی تین ایسی زبردست اہم کتابیں شائع ہوئیں کہ ساری ادبی دنیا میں موضوع بحث بن گئیں۔ ا- ہندوستانی قصوں سے ماخوذ اردو مثنویاں، ۲- اردو غزل اور ہندوستانی ذہن وتہذیب اور تیسری ہندوستان کی تحریک آزادی اور اردو شاعری۔ نارنگ صاحب کی یہ تینوں کتابیں قومی اردو کونسل نے بہت اہتمام کے ساتھ شائع کی ہیں۔ یہ تینوں کتابیں پروفیسر گوپی چند نارنگ کی پچیس ۲۵ سالہ محنت کا ثمرہ ہیں جو دن رات سیکڑوں کتابیں اور ہندوستانی تہذیب کے اندر ڈوب کر لکھی گئی ہیں۔ یوں تو پروفیسر گوپی چند نارنگ نے اپنی تمام زندگی اردو کے لئے اردو زبان وادب کے فروغ اور خدمت کے لئے وقف کر رکھی ہے، ان کا ہر پل اردو زبان وادب کی گفتگو کرتے ہوئے، لکھتے ہوئے پڑھتے ہوئے گزرا ہے، تقریر سے تحریر سے لے کر نجی محفلوں، بیرونی سفر میں ہر جگہ اور ہر طرح سے۔ اردو زبان اس طرح ان کے ذہن و دل پر چھا گئی ہے کہ انھوں نے اپنی پوری زندگی اس کے لئے وقف کر دی ہے۔ یوں تو انھوں نے اتنا کچھ لکھا ہے، اتنا کچھ پڑھا ہے کہ اس کی تفصیل لکھنا شروع کر دی جائے تو زندگی گزر جائے تب بھی ان کے ادبی کارناموں کا احاطہ مشکل ہے لیکن پچھلے ایک سال میں انھوں نے یہ تین ایسی ضخیم اور تاریخ ساز کتابیں اردو ادب کو دی ہیں کہ دنیائے ادب میں ابھی تک ان کا وقار تھا اب اُن کی شخصیت کا رعب بیٹھ گیا ہے، ان

کی شخصیت اور ان کے ادبی کارناموں کی فہرست میں سب سے اہم اُن کی یہ تینوں کتابیں ہیں لیکن اس وقت میرے سامنے ان کی چھ سو صفحات پر مشتمل ایک ضخیم کتاب ''ہندوستان کی تحریک آزادی اور اردو شاعری'' ہے جس کے فلیپ پر نارنگ صاحب لکھتے ہیں:

> ''تین برس پہلے میں نے اردو شاعری کے تہذیبی مطالعہ کے جس منصوبہ کو مکمل کرنے اور قومی اردو کونسل سے شائع کرنے کا کام ہاتھ میں لیا تھا، خدا کا شکر ہے کہ زیرِ نظر کتاب اس کی آخری کڑی ہے جیسا کہ اعلان کیا گیا یہ پروجیکٹ ذیل کی تین کتابوں پر مشتمل ہے،
>
> (۱) ہندوستانی قصوں سے ماخوذ اردو مثنویاں
>
> (۲) اردو غزل اور ہندوستانی ذہن و تہذیب
>
> (۳) ہندوستان کی تحریک آزادی اور اردو شاعری
>
> دیکھا جاتا ہے تو ان کتابوں میں (اچھی بری جیسی بھی ہی ہیں) میری عمر عزیز کا بڑا حصہ کھپا ہوا ہے۔ پیچھے مڑ کر ماضی پر نظر ڈالتا ہوں تو حیرت ہوتی ہے، اس زمانے کی ولولہ انگیزی، انہماک اور آرزومندی میں ایک ایسی آتش سیال تھی جس کا کوئی نام نہیں ہوتا، لیکن جس میں وجود پگھل جاتا ہے۔ میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ اردو کے فتراک میں تازہ نخچیر تھا۔ ہر چند کہ عمر رائیگاں ختم پر آ گئی مگر یہ شاخ نہال آرزو آج بھی ہری ہے۔
>
> اے دل تمام نفع ہے سودائے عشق میں
> اک جان کا زیاں ہے سو ایسا زیاں نہیں
>
> زیرِ نظر کتاب کے تین حصے ہیں۔ ان میں سے ہر حصہ

ایک پوری کتاب ہے۔ پہلا حصہ ہندوستان کے جغرافیائی، معاشرتی قالب سے متعلق ہے یعنی جن فضاؤں میں تحریک آزادی کے تاریخی ارتقا اور منزل بہ منزل اردو شاعری کا مربوط تحقیقی و تنقیدی مطالعہ ہے، یہ پانچ ابواب کو محیط ہے اور کتاب کا مرکزی حصہ ہے۔ تیسرے حصہ میں تحریک آزادی کے چھ اہم شعراء کے خصوصی مطالعہ پیش کئے گئے ہیں جو میرے ان تحقیقی و تنقیدی مقالات پر مبنی ہیں جو اردو شاعری کی قومی و سیاسی جہت پر میں وقتاً فوقتاً لکھتا رہا ہوں۔''

جیسا کہ گوپی چند نارنگ نے لکھا ہے کہ یہ کتاب تین حصوں پر مشتمل ہے، پہلے حصہ میں نارنگ صاحب نے ہندوستان کے جغرافیائی اور معاشرتی پہلوؤں پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے اور تحریک آزادی کے دوران اردو شاعری نے جو رول ادا کیا ہے اس کی تفصیل غزلوں کی روشنی میں دلائل کے ساتھ پیش کی گئی ہے۔ یہ کارنامہ کوئی معمولی کارنامہ نہیں ہے، اس کے لئے گوپی چند نارنگ صاحب نے جس دن سے قلم اٹھایا ہے اسی دن سے گہرائی سے پوری ہندوستانی تہذیب، ہندوستانی تاریخ، فطری آثار و مناظر جو کہ اس کتاب کا پہلا باب ہے۔ اس میں فطری مناظر کے ساتھ ساتھ موسم، پہاڑی مناظر، بول چال، دریا، جھیل، ندی، پنگھٹ، پنہاریاں اور سب سے اہم یہ کہ ان ساری چیزوں کا نارنگ صاحب نے نہ صرف بغور مطالعہ کیا ہے، مشاہدہ کیا ہے بلکہ وہ ہندوستان جیسے عظیم ملک کی ساری روایتوں، رسم و رواج، رہن سہن، طور طریقے، شادی بیاہ، سماجی ناانصافی، لباس اور سماج میں ناپسندیدہ وہ رسمیں جو آج ختم ہو چکی ہیں، جو انسانی رشتوں کو جوڑنے کے بجائے انسانیت کے نام پر ایک بدنما داغ تھیں۔

دو سال کے اندر اندر نارنگ صاحب کی تین ضخیم اہم کتابیں ایسی آئیں کہ ان تینوں کتابوں نے اردو ادب کی تاریخ کو اور ہندوسانی تہذیب کو سمیٹ کر رکھ دیا ہے۔

''ہندوستان کی تحریک آزادی اور اردو شاعری'' بھی اسی نوعیت کی ایک اہم کتاب ہے جس میں نارنگ صاحب نے بتایا ہے کہ اردو شاعری نے تحریک آزادی میں کیا رول ادا کیا ہے اور اس کی مثالیں انھوں نے اردو کے ایسے تمام شاعروں کی اس شاعری سے دی ہیں جنھوں نے اپنی شاعری میں حب الوطنی کے گیت گائے ہیں، چاہے وہ غزل میں ہوں، گیتوں میں ہوں یا مثنوی، رباعی، قطعات یا شاعری کی دیگر اصناف ہوں۔ اس سلسلہ میں نارنگ صاحب لکھتے ہیں:

> ''تہذیب اپنے وسیع معنی میں جملہ ملکی وقومی تفاعل اور سرگرمیوں کو حاوی ہے۔ اس وسیع معنی میں تہذیب تاریخ، معاشرت، سیاست سب کو اپنے گھیرے میں لے لیتی ہے، یعنی تہذیب دھرتی کی بو باس، وطنیت کے احساس اور حریت و آزادی کے تصور و تحفظ میں بھی گہرے طور پر سرایت کیے رہتی ہے۔
>
> زیرِ نظر کتاب جملہ شعری اصناف یعنی غزل، مثنوی، قصیدہ، نظم، گیت، قطعہ، رباعی، فرد سب کا احاطہ کرتی ہے۔ گویا پوری اردو شاعری میں ہندوستان کی تحریک آزادی کا دل دھڑکتا ہوا نظر آئے گا۔ دوسری زبانوں کی اہمیت اپنی جگہ پر لیکن اس ضمن میں اردو شاعری نے جو خدمت کی ہے اس کی نظیر کوئی دوسری زبان پیش نہیں کرسکتی۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ اردو اُس وقت تاریخ و تہذیب کے بڑے دھارے میں تھی، اس لئے سب سے زیادہ کڑی بھی اسی زبان نے جھیلی۔ حالات کی ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ وہی زبان جس نے تحریک آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، جس کے نغمے اَور نعرے ذہنوں میں گونجتے اور دلوں میں ہلچل پیدا کرتے تھے اور جس کی ساری ادبی روایت ہی بین المذہبی ہے

یعنی اتحاد پسندی و رواداری، آشتی و انسانیت سے عبارت ہے، اسی
زبان کو سب سے زیادہ فرقہ واریت کا نشانہ بنایا گیا۔ تاہم تاریخ
کے بطن سے تاریخ پیدا ہوتی ہے، یہ بھی حقیقت ہے کہ تاریخ
بالآخر اپنی غلطیوں کو سنوارتی بھی ہے اور حافظے کے دفینوں سے
مدد بھی لیتی ہے، آزادی کے پچاس پچپن برسوں کے بعد اس نوع
کی کتاب کی اشاعت کا اگر کوئی جواز ہوسکتا ہے تو شاید یہی ہے۔

غالب کہ دلِ خستہ شبِ ہجر میں مرجائے
یہ رات نہیں وہ کہ کہانی میں گزر جائے''

اس اقتباس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ پروفیسر گوپی چند نارنگ جہاں ایک طرف عظیم نقاد، نامور محقق کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں وہیں دوسری طرف وہ اردو کے سچے عاشق اور خاص طور پر اردو غزل کے ایسے شیدائی ہیں جنہوں نے اپنی اس کتاب میں اردو شاعری کے حوالے سے ایک ایسی ضخیم تاریخ مرتب کردی جو آنے والی نسلوں کے لیے ایک دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔ جنگ آزادی میں اردو شاعری نے جو اہم رول ادا کیا ہے وہ کسی سے چھپا نہیں ہے، اس موضوع پر برسوں سے بہت کچھ لکھا بھی جاتا رہا ہے، بڑے بڑے سیمینار اور مشاعرے ہوتے رہے ہیں لیکن اس موضوع پر اتنا مبسوط کام ابھی تک نہیں کیا جیسا کہ گوپی چند نارنگ نے کیا ہے۔ اس کتاب میں نارنگ صاحب نے نہ صرف ایسی تمام شاعری کا احاطہ کیا ہے بلکہ ان شاعروں کی وطن دوستی پر ان کے اشعار کی روشنی میں بحث بھی کی ہے، حالانکہ اس موضوع پر اتنا کچھ لکھا جانے کی وجہ سے قاری کو اب اس موضوع سے کوئی زیادہ دلچسپی نہیں رہی، لیکن نارنگ صاحب نے اس کام کو اتنے اہتمام اور انہماک سے کیا ہے کہ اس خشک موضوع میں بھی انہوں نے دلچسپی پیدا کردی ہے۔ ایسے کارنامے بلاشبہ ایک ایسا نقاد، ایک محقق ہی کرسکتا ہے جس کی زندگی اور ذہن و دل میں وطن کی عظمت وطن کی محبت رچ بس گئی ہو، نارنگ

صاحب نے اپنی آدھی زندگی اس کام میں صرف کی ہے تب کہیں جا کر وہ اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچا پائے جو اس وقت کتابی شکل میں ہمارے سامنے ہے۔ کتاب کے حصہ اول میں یعنی پہلے باب میں گوپی چند نارنگ نے ہندوستان کے موسم، پہاڑی مناظر، کھیل کود، چرندے، پرندے، پھل، نباتات، پھولوں کی مہک، باغات، مقامات کی منظر کشی کی ہے۔ باب دوم میں مشترک ہندوستانی معاشرت کے عنوان سے ہندوستانی تہواروں مثلاً ہولی، دیوالی، میلاد، نعت نگاری، رکشہ بندھن، بسنت پنچمی، جیسے تہواروں پر روشنی ڈالی ہے۔ میلے ٹھیلے، مشاغل، رسم و رواج، شادی بیاہ، بٹیر بازی، کبوتر بازی، پتنگ بازی اور پھر لباس و لوازمات میں کنگھی چوٹی، بیگمات، شہزادیاں، رقاصائیں، خادمائیں، پنگھٹ، جوگنیں، ان کے رہن سہن اور طور طریقوں پر نظر ڈالی ہے اور پھر اتنی لمبی تمہید کے بعد اردو شاعری میں حب الوطنی کا جائزہ لیا ہے۔ امیر خسرو سے لے کر محمد قلی قطب، شاہ وجہی، نصرتی، دکنی شعراء کی شاعری پر نظر ڈالتے ہوئے ۱۸۵۷ء تک آجاتے ہیں۔ چوتھے باب میں ۱۸۵۷ء اور اردو شاعری کے عنوان سے نواب سراج الدولہ اور اس وقت کی سیاسی معاشی صورت حال کا جائزہ لیتے ہوئے غالبؔ، شیفتہ، ظہیرؔ دہلوی، بہادر شاہ ظفرؔ اور ایسے تمام شعراء کا ذکر کیا ہے جن کی شاعری میں حب الوطنی نمایاں ہے، چاہے وہ مثنوی میں ہو، غزل میں ہو یا اردو شاعری کی کسی دوسری صنف میں ہو۔ یہاں جرأت کے چند اشعار پیش کئے جاتے ہیں:

کہیے نہ انھیں امیر اب اور نہ وزیر
انگریزوں کے ہاتھ میں قفس مین اسیر
جو کچھ وہ پڑھائیں سو یہ منہ سے بولیں
بنگالے کی مینا ہیں یہ یورپ کے امیر

اسی طرح مثنوی جہادیہ کے چند شعر جو نارنگ صاحب نے اس کتاب میں پیش کئے ہیں یہاں نوٹ کر رہا ہوں:

عجب وقت ہے یہ جو ہمت کرو　　حیات ابد ہے جو اس دم مرو
سعادت ہے جو جانفشانی کرے　　یہاں اور وہاں کامرانی کرے
الٰہی مجھے بھی شہادت نصیب　　یہ افضل سے افضل عبادت نصیب
الٰہی اگرچہ ہوں میں تیرہ کار　　پہ تیرے کرم کا ہوں امیدوار
یہ دعوت ہو مقبول درگاہ میں　　مری جاں فدا ہو تری راہ میں
میں گنج شہیداں میں مسرور ہوں　　اسی فوج کے ساتھ محشور ہوں

اس طرح نارنگ صاحب نے اس پوری کتاب میں ایسی شاعری پیش کی ہے جو جنگ آزادی کے لئے راہیں ہموار کرتی رہی ہے۔ یہاں زیادہ شعری حوالے نہ دیتے ہوئے میں صرف کتاب کے ابواب پر ایک سرسری نظر ڈال رہا ہوں۔

پانچویں باب میں نارنگ صاحب نے ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد کی شاعری اور حالات کا جائزہ لیا ہے جس میں حالی، شبلی، آزاد کے علاوہ سماجی اصلاحی تحریکیں اور سر سید احمد تحریک، مسلم لیگ کا قیام اور چکبست، اقبال، اسمٰعیل میرٹھی، حسرت، سلیم شوق قدوائی، عظمت اللہ خاں اور دیگر کے کارناموں پر روشنی ڈالتے ہوئے ابوالکلام آزاد اور اُن کے الہلال کا ذکر بھی تفصیل سے کیا ہے۔ ''ہندوستان کی تحریک آزادی اور اردو شاعری'' میں سب سے آخری باب ترقی پسند اور قوم پرست شعراء میں نارنگ صاحب نے بہت ہی دلائل سے ترقی پسند تحریک کے آغاز سے لے کر اقبال، حسرت اور سامراج دشمنی کی ہم نوا ترقی پسند تحریک آزادی پر بحث کرتے ہوئے منشی پریم چند، سجاد ظہیر، فراق گورکھپوری، مجاز، جذبی، مخدوم، جاں نثار اختر، مجروح، کیفی، کے نظریات پیش کرتے ہوئے کانگریس کی کامیابی، مسلم لیگ کا جداگانہ مطالبہ، دوسری جنگ عظیم کا اعلان ہندوستان چھوڑدو تحریک کے آغاز سے لے کر جوش مجاز، مخدوم، فیض احمد فیض اور ترقی پسند تحریک سے منسلک تمام اہم شعرا کی ایسی شاعری کا انتخاب پیش کیا ہے جو انقلابانہ اور وطن پرستی کا پیغام دیتی ہے اور ان پر مختصر نوٹ جیسے مجاز انقلاب کا مطرب، جوش ایسٹ

انڈیا کمپنی کے فرزندوں کے نام وقت کا پیغام، قحط بنگال جوش کی احتجاجی شاعری، فیض حلقہ زنجیر میں زباں اور سردار جعفری کی مشہور نظم ''نئی دنیا کو سلام'' پر بہت تفصیل سے گفتگو کرتے ہوئے نارنگ صاحب نے ان شاعروں کی شاعری کے حوالوں سے وطن پرستی کے جذبات سے لبریز انتخاب پیش کیا ہے اور قومی شاعری، وطن پرستی کے جذبات پڑھنے والوں تک میں پیدا کر دیئے ہیں، ایسی کتابیں تمام عمر لکھنے اور پڑھنے کے بعد بھی وجود میں نہیں آسکتیں جب تک کہ کوئی محقق ناقد وطن پرستی کے جذبات سے سرشار ہو کر اس میں ڈوب نہ جائے اور نارنگ صاحب ایک ایسے ہی محقق ناقد ہیں جنھوں نے اپنی تمام زندگی اردو شعر و ادب میں ڈوب کر سمندر کی تہوں سے چن چن کر موتی تلاش کئے ہیں، تب کہیں جا کر ایسی تاریخی تحقیقی دستاویزی کتاب منظر عام پر آسکی ہے۔ ان کی اس نوعیت کی تینوں کتابیں ہی ایسی کتابیں ہیں کہ اگر نارنگ صاحب نے اپنی پوری زندگی میں ایک لفظ بھی نہ لکھا ہوتا تو صرف یہ تینوں کتابیں ہی انھیں اردو ادب میں زندہ رکھنے کے لئے ایک قیمتی سرمایہ سمجھی جاتیں۔

اردو غزل اور ہندوستانی ذہن وتہذیب

از گوپی چند نارنگ

''اردو غزل اور ہندوستانی ذہن وتہذیب'' محسن اردو پروفیسر گوپی چند نارنگ کی ایک تاریخ ساز کتاب ہے۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ دنیائے اردو ادب کا وقار ہیں، اس کی عزت ہیں، اس کی شان ہیں۔ اس وقار و عزت اور ہندوستانی تہذیب کے وقار کو بڑھانے کے لئے انہوں نے ایسے ایسے کارنامے انجام دیئے ہیں کہ دنیا حیران رہ گئی ہے۔ یوں تو ان کی زندگی کا ہر پل اردو کی خدمت میں صرف ہوا ہے، وہ اردو ہی سوچتے ہیں، اردو ہی بولتے ہیں، اردو ہی لکھتے ہیں، اردو پڑھتے ہیں، اردو کے لئے سفر کرتے ہیں، اردو کے گن گاتے ہیں، اردو کی عظمت کا جھنڈا ہر جگہ بلند کرتے ہیں، اپنی تقریروں سے اپنی تحریروں سے، کبھی غزل کے حوالے سے تو کبھی مثنوی کے حوالے سے، کبھی ہندوستانی داستانوں کے حوالے سے۔ جو ہندوستانی تہذیب ان کے ذہن و دل میں بس گئی ہے اسی ہندوستانی تہذیب کا پرچم پوری دنیا میں اپنی ایسی ایسی کتابوں کے ذریعہ بلند کرتے ہیں کہ ہم اہل اردو جو اپنی تہذیب سے ناآشنا رہے ہیں انہیں بھی احساس کمتری کے دائرے سے نکال کر سینہ تان کر کھڑا کرنے میں ہماری مدد کرتے ہیں۔ ایک سال پہلے ایک ایسا ہی ادبی کارنامہ انہوں نے ہندوستانی مثنویوں کے حوالے سے ایک ضخیم کتاب لکھ کر کیا تھا اور اب یہ ایک اور دوسرا ادبی کارنامہ غزل کے حوالے سے اردو غزل اور ہندوستانی ذہن وتہذیب کے عنوان سے کتاب لکھ کر کیا ہے جس میں ہندوستانی تہذیب کو ایک مکمل کتاب میں سمو دیا ہے جس کے پہلے باب میں انہوں نے ہندوستانی تہذیب کے ارتقاء پر نظر ڈالتے ہوئے ہندوستانی لوگوں کا مزاج، قدیم ہندوستانی

تہذیب، ویدی تہذیب، بودھی تہذیب، پوانک تہذیب، گیتا شومت اور وشنومت پر نہ صرف ایک طائرانہ نظر ڈالی ہے بلکہ بات ہی سے بات پیدا کر کے مستند حوالوں سے بحث کی ہے، اس پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے اور سب سے بڑھ کر اہم بات یہ ہے کہ یہ سب کچھ غزل کے حوالے سے کیا ہے جبکہ وہ چاہتے تو اسے کچھ اور عنوان دے سکتے تھے مثلاً ویدی تہذیب اور ہندوستان کے دیگر مذہبوں کے ہندوستانی تہذیب پر اثرات وغیرہ وغیرہ۔ لیکن غزل کی عظمت کو بلند کرنے کے لئے، غزل کو دنیا کے دیگر ادب کے مقابلہ میں بلند کرنے کیلئے کیسے کیسے موتی نکالے ہیں کہ نارنگ صاحب کی عظمت بھی دلوں پر بیٹھ گئی ہے۔ اس کے لئے انہوں نے کتنا مطالعہ کیا ہوگا، کتنا وقت لگایا ہوگا، کتنے دن، کتنے مہینے، کتنی راتیں، جاگ کر اپنی صحت خراب کی ہوگی، یہ سوچ سوچ کر ہی دماغ میں ایک ہیجان سا پیدا ہو جاتا ہے اور دماغ کی رگیں پھٹنے لگتی ہیں، مثلاً وہ ایک جگہ ہندوستان کا جغرافیہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''ہندوستانی مزاج کے اس فکری رجحان کو قائم رکھنے میں بڑا حصہ یہاں کی نباتاتی زندگی کا بھی رہا ہے، شہری تمدن کے پھیلنے سے پہلے ہندوستان کا بڑا حصہ جنگلوں پر مشتمل تھا، زندگی چونکہ فراغت و اطمینان سے بسر ہوتی تھی اس لئے جنگلوں ہی میں آشرم بنا کر رہنا معمولات میں سے تھا۔ ہندوستان میں ذہنی اور مذہبی تربیت کے قدیم ترین مراکز یہی آشرم اور تپون تھے۔ وید، اپنشد، پران وغیرہ مختلف شاستر انہیں آشرموں میں لکھے گئے۔ ہندوستان میں یوں بھی موسم صاف رہنے کی وجہ سے دوپہر یا رات کے وقت طبیعت یک گونہ تنہائی محسوس کرتی ہے۔ لیکن جنگل کی فضا میں گہرے سکوت اور سناٹے سے مل کر تنہائی کا یہ احساس کچھ ایسا پُراسرار بن جاتا ہے کہ ذہن پر دھیان یا مراقبے کی کیفیت از خود طاری ہونے لگتی ہے۔ انسان کی ذات حیرت اور استعجاب کے عالم میں ڈوب جاتی ہے حواس کے امتیازات مٹنے لگتے ہیں اور

نفس وجدانی زمین سے آسمان تک ایک ہی حقیقت کو جلوہ گر دیکھتا ہے۔''

اس مختصر سے اقتباس کو پڑھ کر اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ نارنگ صاحب نے اپنی کتاب کے ابتداء ہی میں ہندوستانی جغرافیہ، یہاں کی فضا، یہاں کے جنگلوں اور آشرموں کے بارے میں سب کچھ بتادیا کہ یہی وہ فضا ہے جس میں ہندوستانی ذہن کی نشوونما ہوتی ہے۔ جس طرح ان آشرموں میں آدمی ذہنی سکون وشانتی کی تلاش میں پناہ لیتا تھا لیکن یہیں سے پھر ایسی ایسی تخلیقات وجود میں آئیں کہ بعد میں وہ ہندوستانی تہذیب کا قیمتی سرمایہ کہلائیں۔ یعنی حق کی تلاش میں سرگرداں مہاپرشوں، صوفیوں، سنتوں نے جو کچھ لکھا، جو کچھ کہا جو آگے چل کر زبان وادب کا قیمتی سرمایہ بنا، اس کی جڑیں یہیں پیوست تھیں۔ توحید، معاشرتی عدل اور مساوات ، اثبات عمل، عقلی وفکری رجحان، علمی وادبی رجحان، مذہبی احساس، اسلامی تصوف، نشوری پہلا دور، دوسرا دور، صوفیائے کرام، نظری پہلو، عملی پہلو، تصوف اور ہندی اثرات۔ نارنگ صاحب نے ان تمام پہلوؤں پر بھرپور روشنی ڈالی ہے ایک ایک بات کو اجاگر کرنے کیلئے کئی کئی طرح سے بحث کی ہے اور مشترک ہندوستانی تہذیب، تاریخی پس منظر، بھگتی تحریک، شنکر آچاریہ رامانج راما نند، کبیر، گرونانک، نرائن لگن واد، زبان کی نشو ونما میں جن جن تحریکوں، سنتوں، صوفیوں، آشرموں، جنگلوں، پہاڑوں، ندیوں، جھرنوں، مصوری، موسیقی، فن تعمیر نے جیسا بھی رول ادا کیا ہے اور جس جس نے بھی جس طرح بھی زبان کی نشوونما میں اس کے ماحول بنانے میں کردار ادا کیا، اس کی ساری تفصیل اس کتاب میں موجود ہے اور ان ساری تحریکوں فارسی، عربی، سنسکرت، ہندی، ایرانی، آریائی تہذیبوں کے ٹکراؤ، ان کے میل جول سے جو زبان وجود میں آئی اس کی تفصیل بتاتے ہوئے غزل کے اثرات یا ان سارے عوامل میں غزل پر اثرات، اس کے تاریخی، سیاسی، سماجی پس منظر میں جائزہ لینا، وہ بھی کسی ایسے شخص نے جس کی مادری زبان اردو نہ رہی ہو اتنا بڑا کارنامہ انجام دینا کیا اردو زبان پر ایک عظیم احسان نہیں ہے۔ یہ کارنامہ صرف وہی ہستی

انجام دے سکتی ہے جس نے اردو کو اپنی جان سے زیادہ چاہا ہو، اس لئے کہ اس کتاب کا موضوع ہی ایسا ہے۔ اگر اردو سے، اردو غزل سے انہیں اتنا پیار نہ ہوتا تو اتنی گہرائی اور اتنی مشکلات سے گذر کر تحقیقی اس کام کو وہ کوئی بھی موضوع دے کر ہندوستانی تہذیب میں گیت کاروں، ہندوستانی تہذیب، صوفی سنتوں کا رول اور ہزاروں سال پرانی روایات میں ویدوں کی تہذیب غرض یہ کہ وہ اس کتاب اور اس جان جوکھم والے تحقیقی موضوع کو کچھ دوسرا ہی موڑ دے سکتے تھے لیکن ایک سچے اردو پرست، اردو زبان سے عشق نے انہیں اتنا بڑا کارنامہ انجام دینے پر اکسایا اور ایسی دستاویزی کتاب سامنے آسکی۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے کہ اس کتاب کے پہلے باب میں ہندوستانی تہذیب کے ارتقاء پر نظر ڈالتے ہوئے تمام سیاسی سماجی جغرافیائی پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ مذہبی مصوری موسیقی جیسے کئی پہلوؤں اور ان کے جمالیاتی پہلوؤں کو اُجاگر کرتے ہوئے اردو غزل کے جمالیاتی پہلوؤں پر گفتگو کی ہے، یعنی اس کتاب کا دوسرا باب اسی عنوان سے قائم کیا ہے اس سے پہلے کہ اس کتاب سے متعلق آگے گفتگو کی جائے خود نارنگ صاحب کے دیباچے سے یہ اقتباس پیش کر دینا ضروری ہے، وہ لکھتے ہیں:

''زیرِ نظر کتاب پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلا باب ہندوستانی تہذیب کے ارتقا بالخصوص مشترک ہندوستانی تہذیب اور اس کی جملہ جہات پر مبنی ہے۔ اس کو پیش نگاہ رکھنا اس لئے ضروری ہے کہ یہی وہ سرچشمہ ہے جس سے اردو وجود میں آئی۔ اختصار کے پیشِ نظر فقط ان نکات کو ابھارا گیا ہے جو آئندہ ابواب کے مباحث کی بنیاد ہیں۔ یہ تمام ابواب ایک مبسوط بحث کی کڑیاں ہیں، ان کو بطور واحد الگ الگ نہ دیکھا جائے، ہر چند کہ غزل میں مرکزیت عشق کے تصور کو حاصل ہے تاہم عشق اس عہد کی مابعد الطبیعاتی آئیڈیولوجیکل سوچ اور عمرانیاتی شناخت کا حصہ ہے یا دوسرے لفظوں میں یہ اس تہذیبی و فکری تموج کا تشکیل کردہ ہے جو بھگتی اور تصوف کے سابقے سے وجود پذیر ہوا

تھا۔“

اس دیباچے میں پوری کتاب کا خلاصہ بیان کردیا گیا ہے۔ کہنے کا مطلب صرف یہ ہے کہ پروفیسر گوپی چند نارنگ نے اس تحقیقی کتاب میں اس کے ایک ایک پہلو پر روشنی ڈالنے کے لئے سیاسی، سماجی پس منظر کے ساتھ ساتھ ہندوستانی پوری تحقیق کو سمجھ کر رکھ دیا ہے یعنی دوسرے باب میں جس میں کہ اردو غزل کے جمالیاتی پہلو کو اجاگر کیا گیا ہے، اس میں عشق زندگی کا مرکز و محور، تہذیبی اور سماجی تناظر، اسلامی تصوف اور تصورِ عشق، ہندوستانی ملکی روح اور شدت احساس کا بیان کرتے ہوئے اردو غزل کی ساری کیفیات پر ایک گہری نظر ڈالی گئی ہے اور مثال پیش کرتے ہوئے اردو غزل کے منتخب اشعار بھی پیش کئے گئے ہیں۔ یعنی محمد قلی قطب شاہ اور دکنی شاعری کا جائزہ لیتے ہوئے دیگر درجنوں شاعروں مثلاً انشاء، ناسخ، خواجہ میر درد، سراج دکنی قائم میر حسن تاباں، یقین، سوز، اثر، جرأت، حاتم، سودا جیسے کئی شاعروں کے اشعار بھی پیش کئے گئے ہیں اور اردو غزل کے جمالیاتی پہلوؤں پر گفتگو بھی کی ہے۔ مثلاً تصورِ عشق پر گفتگو کرتے ہوئے اور تصوف کے ان رجحانات پر روشنی ڈالتے ہوئے عشق مجازی اور عشق حقیقی پر بحث کرتے ہوئے ان اشعار کو پیش کیا ہے جو روحانی تخلیقی کیف و سرور کے آئینہ دار ہیں مثلاً درد کے یہ چند شعر ؎

جگ میں آکر اِدھر اُدھر دیکھا تو ہی آیا نظر جدھر دیکھا
جان سے ہوگئے بدن خالی جس طرف تو نے آنکھ بھر دیکھا
ان لبوں نے نہ کی مسیحائی ہم نے سوسو طرح سے مر دیکھا

یہ اشعار تصورِ عشق کے دلائل میں پیش کئے گئے ہیں۔ اس طرح سے مومن، فراق، منیر، شیفتہ، میر، غالب کے کئی کئی اشعار پیش کئے گئے ہیں اور اردو غزل کے جمالیاتی پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اسی طرح اس کتاب کے تیسرے باب میں جو تصورِ حسن و جمال کے عنوان سے ہے، اس باب میں بھی اسی طرح کے سینکڑوں اشعار

پیش کئے گئے ہیں جن میں حسن و شباب اور عشقیہ جذبات سے بھرپور غزل کے جمالیاتی پہلوؤں کو دیکھا گیا ہے۔ اس باب میں محمد قلی قطب شاہ، غواصی ہاشمی، ولی دکنی، سراج اورنگ آبادی، میر، سودا، تاباں، یقین، راسخ عظیم آبادی جیسے کئی شاعروں کے اشعار پیش کئے گئے ہیں۔ اس کتاب کا سب سے اہم حصہ جسے کہہ سکتے ہیں یا کہنا چاہئے وہ ہیں اس کتاب کے ابتدائی پہلے اور دوسرے ابواب جن میں کہ نارنگ صاحب نے ہندوستانی تہذیب کے عناصر اور سیاسی تاریخی سماجی پس منظر کی نہ صرف عکاسی کی ہے بلکہ پوری انسانیت، تہذیب کو اجاگر کر دیا گیا ہے یعنی تمہید ہی اتنی زوردار طریقے سے کی گئی ہے کہ کوئی پہلو تشنہ نہ رہا اور غزل کے حوالہ سے ہندوستانی گنگا جمنی تہذیب اور صدیوں پر محیط ہندوستانی تاریخ کو پیش کر دیا ہے۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ کا یہ اتنا بڑا کارنامہ ہے جو ان کی پوری زندگی کا نچوڑ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا اس لئے کہ وہ اس موضوع پر برسوں سے کام کرتے چلے آرہے ہیں اور بچپن سے ہی اس موضوع کو انہوں نے اپنے ذہن و دل کے گوشے میں اس طرح رچا بسا دیا تھا کہ آج وہ سارا مواد ایک تاریخ ساز کتاب کی شکل میں منظر عام پر آگیا۔

☆☆☆☆

اطلاقی تنقید نئے تناظر میں

گوپی چند نارنگ

اس کتاب کی اہمیت اس لئے بھی زیادہ ہے کہ یہ ایک ایسے سیمینار میں پڑھے گئے مضامین پر مشتمل ہے جس نے ادبی دنیا میں نئے رجحانات کا خیر مقدم کرتے ہوئے کئی راہیں ہموار کرنے میں ایک اہم رول ادا کیا ہے۔ اور یہ سب پروفیسر گوپی چند نارنگ صاحب کے ذہن کی پیداوار ہے کہ ایسے موضوع پر زبردست سیمینار منعقد کر کے اس میں پڑھے گئے مضامین کو کتابی شکل میں شائع کر دیا اور ادبی دنیا کو نئی سوچ اور نیا ذہن بنانے میں نہ صرف معاونت کی بلکہ اس میں پڑھے گئے بہت سے مضامین میں عصری شعر و ادب پر مکمل گفتگو کرنے اور سننے کا موقع بھی فراہم کیا۔ آج کل کیا کچھ لکھا جا رہا ہے اور کس معیار کا ہے، چاہے وہ ناول ہو افسانہ ہو غزل ہو یا نظم سب پر اظہار خیال کیا گیا۔

اس کتاب میں سب سے پہلے تو پروفیسر گوپی چند نارنگ کا مضمون شامل ہے جس میں انہوں نے سوال اٹھایا ہے کہ کیا تنقید کی بدلتی ترجیحات اور رویّے ہمیشہ نظریاتی اور اقداری نہیں ہوتے؟ اپنے اس مضمون میں انہوں نے ثابت کیا ہے کہ ہر ادب میں رویّے اور نظریات کا بدلنا ناگزیر ہے کیونکہ بغیر نظریات کی تبدیلی کے ادب میں جمود طاری ہو جاتا ہے۔ نظریات و رویّے ماحول کی تبدیلی کی دین ہوتے ہیں۔ کوئی بھی سچا فنکار اس بات سے انکار نہیں کر سکتا۔ دوسرا مضمون پروفیسر وہاب اشرفی کا ہے جس میں

انہوں ''مابعد جدیدیت اور کلاسیکی اردو شاعری کا نیا تناظر'' کے عنوان سے تفصیل سے گفتگو کی ہے، وہ لکھتے ہیں :

''ایک زمانہ تھا کہ وجودی فلسفہ کی یلغار کے سبب زندگی اور اس سے متعلق ادب سکڑ سمٹ گیا تھا۔ زندگی کے نہاں خانوں میں جھانکنے کا عمل اتنا تیز ہوا کہ باہر کی تمام روشنیاں اور رونقیں معدوم ہوگئیں۔ ہوسکتا ہے بلکہ ہوا بھی کہ اس اندازِ فکر سے بھی ادب کے کئی زاویے سامنے آ گئے جو نسبتاً معیاری بھی ہیں لیکن اس ذہنی رویہ کے ساتھ تا دیر چلتے رہنا اندھے کنویں میں چھلانگ لگاتے رہنا ہے، لہٰذا مابعد جدیدیت رویہ نفی کو اثبات میں بدلتا ہے تو اس میں نقصان کا کوئی پہلو نہیں ہے۔''

پروفیسر وہاب اشرفی نے اپنے مضمون میں مابعد جدیدیت کی حمایت کرتے ہوئے اس بات پر زور دیا ہے کہ اس میں کیا برائی ہے اگر مابعد جدیدیت کی نئی اطلاقی تھیوری کی روشنی میں گفتگو کی جائے۔ اسی طرح پہلے کے ادب کے بارے میں پروفیسر ابوالکلام قاسمی نے اختر الایمان کی نظموں کی تفہیم نو کی کوشش کی ہے۔ قاضی افضال حسین نے 'راشد کے جہات' کے عنوان سے راشد کی شاعری کا جائزہ لیا ہے اور بہت سے نئے پہلو تلاش کئے ہیں۔ اس طرح عقیل احمد نے '' میراجی ایک نئی تعبیر'' کے عنوان سے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ خورشید احمد نے راجیند رسنگھ بیدی کی فکشن نگاری کا جائزہ لیا ہے۔ ڈاکٹر صادق نے عصمت چغتائی کی افسانوی صنف اور شافع قدوائی نے '' افسانے کی نئی بوطیقا اور انتظار حسین'' کے عنوان سے مضمون تحریر کیا ہے۔ گویا پہلے کے ادب کا بھرپور جائزہ ان مضامین میں شامل ہے۔

دوسرا باب اس کتاب میں غزل سے متعلق ہے جس میں معاصر اردو غزل نئے تنقیدی تناظر میں، پروفیسر حامدی کاشمیری، نظام ......، شین کاف نظام، جمال اویسی نے

نئی غزل میں معنویت کی تلاش کی ہے اور بہترین منتخب اشعار کی روشنی میں تفصیل سے آج کی شاعری کا جائزہ لیا ہے۔ تیسرے باب میں نظم سے متعلق مضامین ہیں جن میں پہلا مضمون عزیز پریہاری کا ہے جو انگریزی میں ہے۔ معاصر نظم پر نئے تناظر کی روشنی میں حقانی القاسمی نے بہت اچھا مضمون تحریر کیا ہے۔ اسی طرح قاضی جمال حسن نے معاصر نظم تنقیدی تناظر اور شناخت کے مسئلہ کے عنوان سے گفتگو کی ہے۔ یہاں یہ بات ضرور کہنا ہے کہ کسی کا لکھا بھی حرف آخر نہیں ہوتا۔ سیمینار میں پیش کئے گئے مضامین میں کوئی ضروری نہیں کہ ہر لکھنے والا تمام شاعروں کا ذکر کرے بلکہ زیادہ تر مضامین میں انہیں شاعروں پر گفتگو کی جاتی ہے یا انہیں کے شعر نقل کئے جاتے ہیں جو اکثر رسائل میں چھپتے رہتے ہیں اور جن کا نام فن کے شعری حوالوں میں آتے رہتے ہیں۔ ظاہر کہ ان میں بہت سے نام رہ جاتے ہیں۔ لیکن سلسلہ شروع ہو جاتا ہے، ایک سے دوسرے اور پھر تیسرے تک حوالوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے اور انہی ناموں کو لوگ الٹ پھیر کے پیش کرتے رہتے ہیں۔ جیسا اکثر ہوتا ہے ان مضامین میں بھی بہت سے قابل ذکر شعراء کا تذکرہ نہ ہو سکا، لیکن لکھنے لکھانے اور گفتگو کرنے کے لئے راہیں ہموار تو ہوئی ہیں، اور ان سب باتوں کے لئے پروفیسر گوپی چند نارنگ مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے اتنا زبردست سیمینار کر کے آغاز تو کیا کہ یوں ہونا چاہیے۔ اسی طرح اس کتاب میں دیگر مضامین ناول، افسانہ سے متعلق ہیں۔ معاصر افسانہ اور معاصر ناول پر بہت ہی تفصیلی مضامین شامل ہیں۔ شمیم عثمانی نے پروفیسر گوپی چند نارنگ اور اطلاقی تنقید کے عنوان سے بہت شاندار مضمون تحریر کیا ہے اور گوپی چند نارنگ کی تنقید نگاری پر تفصیل سے بہت ہی معلوماتی حوالوں کے ساتھ بحث کی ہے اور نارنگ صاحب کی تنقید کی خوبیوں، ان کے مطالعہ اور صلاحیتوں کا بھرپور جائزہ لیا ہے۔

☆☆☆☆

پروفیسر گوپی چند نارنگ ہمعصروں کی نظر میں

خالد بگوش، کراچی:

''ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے ظاہری اور باطنی کمالات کا احاطہ کرنا بہت مشکل ہے، وہ اعلیٰ درجہ کے نقاد و ماہر لسانیات ہیں۔ ان کی شناوری کا لوہا فضیل جعفری جیسے تنک مزاج نے بھی مانا ہے جو اپنے علاوہ کسی اور کو نقاد ماننے سے پہلے سو مرتبہ سوچتے ہیں۔ اپنے بارے میں اس لئے نہیں سوچتے کہ مسلّمات پر بحث کرنا ان کی عادت نہیں، ڈاکٹر نارنگ کو ماہر لسانیات ہونے کی سند ڈاکٹر گیان چند نے بھی عطا کی ہے جو خود اس میدان کے شہسواروں میں سے ہیں اور شہسوار بھی ایسے کہ ایک مرتبہ انھوں نے ڈاکٹر شوکت سبزواری جیسے جید عالم کو بھی اپنے توسن لسانیات کی گرد بنا ڈالا تھا اور بعد میں معذرت بھی کی تھی۔ ڈاکٹر نارنگ کے سلسلہ میں معذرت کا ارادہ نہیں رکھتے۔

قمر جمیل، کراچی:

ساختیات اور پس ساختیات کے مباحث ایک طویل عرصے سے دریافت میں شائع ہوتے رہے ہیں، ان میں خاص طور پر پروفیسر گوپی چند نارنگ کے مضامین ہمارے قارئین کی دلچسپی کا مرکز رہے ہیں۔ پاکستان میں گوپی چند نارنگ صاحب نے جو لکچر دیے اور جو مضامین دریافت اور صریر میں شائع ہوئے وہ بڑے فکر انگیز ثابت ہوئے، اس قدر کہ صرف یہ موضوع ہماری تنقید کا مبحث بن گیا۔

فرمان فتح پوری، کراچی:

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ عہد حاضر کے اُن لکھنے والوں میں ہیں جن کا شمار صف اوّل کے ادیبوں میں ہوتا ہے اور صف اول کا ادیب ہونا عمر بھی کی ریاضت قلم کا حاصل و مطالعاتی شغف کا ثمر ہوتا ہے، چنانچہ یہ رتبۂ بلند سب کو نہیں کسی کسی کو میسر آتا ہے، بقول شاعر ؎

یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا   ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں

اس عظیم منصب پر فائز ہونے والے صاحب قلم کو بعض نے اسکالر اور دانشور کا نام دیا ہے، بعض نے نقاد و محقق کے نام سے موسوم کیا ہے، چنانچہ ڈاکٹر نارنگ کو ان کے علم و فضل اور ان کی لسانی و ادبی خدمات کے حوالے سے خواہ کتنے ہی القاب سے ملقب اور کتنی ہی صفات سے متصف کریں آخرکار بالا جمال یہی کہنا ہوگا کہ وہ صف اوّل کے ادیب ہیں۔

انتظار حسین، لاہور:

ڈاکٹر نارنگ کی یہ بات نظر انداز کرنے کے لائق نہیں کہ جس طرح ترقی پسندوں کی حماقتوں نے سبق سیکھنے کی ضرورت تھی اسی طرح جدیدیت والوں کی حماقتوں سے بھی سبق سیکھنے کی ضرورت ہے۔ پتے کی بات یہ ہے کہ ادب آئیڈیالوجی سے بیگانۂ محض بھی نہیں، یہ وہ حماقت ہے جو جدیدیت والوں نے ترقی پسندوں کی ضد میں کی تھی۔ ڈاکٹر نارنگ بالاصرار کہتے ہیں اور ٹھیک کہتے ہیں کہ مابعد جدیدیت یا نیا ذہن سماجی و سیاسی مسائل سے غیر وابستہ نہیں ہوسکتا۔

شمس الرحمٰن فاروقی:

گوپی چند نارنگ! آپ میں ایک اور خوبی ہے جو شاید مجھ میں اور آپ میں مشترک ہے، وہ یہ کہ آپ مطالعہ غیر مشروط ذہن سے کرتے ہیں، ادب سے یہ تقاضا نہیں کرتے کہ وہ آپ ہی کے معتقدات اور تصورات کی ترجمانی کرے۔ آپ اس بات پر اصرار کرتے ہیں کہ ادب اپنی جگہ خود ایک سچائی ہے، کوئی ضروری نہیں کہ یہ سچائی اس فلسفیانہ یا اخلاقی نظام سے ہر جگہ اور ہر طرح ہم آہنگ ہو جسے نقاد خود مانتا اور قبول کرتا ہے، ادب کے ساتھ آپ کا Passionate commitment یعنی انتہائی سچا، گہرا، بے لوث لگاؤ مثالی حیثیت رکھتا ہے، اقبالؔ ہوں یا غالبؔ، میر انیسؔ ہوں یا آج کا کوئی نوجوان شاعر، آپ ان سب کا مطالعہ یکساں خلوص و یقین کے ساتھ اور ذہن کو یکساں آزادی کے ساتھ کرتے ہیں، وہ نقاد ہی کیا جس کے ذہن کی تمام کھڑکیاں کھلی نہ

ہوں اور جس کی شخصیت کے تمام گوشوں میں ادب کی محبت خالصتاً ادب کی خاطر نہ ہو، ...... آج کی خود غرض دنیا میں ادب اور صرف ادب کے ساتھ آپ کی گہری وابستگی ہمارے لیے امید کی کرن کا کام کرتی ہے۔ آخر میں ایک بات یہ بھی کہہ دوں کہ لسانیات اور تاریخ ادب اور ترجمہ بھی وہ میدان ہیں جن میں آپ دور دور تک تنہا نظر آتے ہیں۔ ہمارے اکثر معاصر یہاں آپ کے ہم عنان و ہم رکاب تو کیا آپ کے رہوار قلم کے پیچھے پیچھے بھی نہیں چل سکتے، میں تو صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ اس زمانہ میں کیا ہر زمانہ میں ادب کی اقدار کے نقاد بہت کم ہوتے ہیں۔ آپ ان چند میں بھی ممتاز ہیں۔

پروفیسر صادق، دھلی :

گزشتہ پچیس تیس برسوں میں جن جدید نقادوں نے اردو فکشن کی تنقید کو اعتبار کا درجہ عطا کیا ہے ان میں گوپی چند نارنگ کا نام نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ گوپی چند نارنگ بنیادی طور پر فکشن ہی کے نقاد ہیں مگر بعدازاں لسانیات کو انہوں نے اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیا۔ لسانیات سے ایک ربط خاص رکھنے کے باوجود انہوں نے فکشن کی تنقید سے منہ نہیں موڑا، ہندوستانی قصوں سے ماخوذ مثنویوں کا مطالعہ ایک تحقیقی مطالعہ تھا جس کے توسط سے وہ کلاسیکی مشرقی افسانوی ادب کے ان سلسلوں تک پہنچے تھے جن پر ہماری نظر بہت کم گئی تھی بلکہ یہ سلسلے وہ تھے جو آہستہ آہستہ ہماری یادداشتوں سے مٹتے جارہے تھے۔ دراصل انہیں قصوں اور داستانوں کی چھان پھٹک کرتے ہوئے وہ پرانوں کی کہانیوں، کتھا سرت ساگر، طلسم ہوش ربا اور الف لیلیٰ وغیرہ جیسے عظیم ترین کلاسیکی اثاثے تک پہنچے اور ان چیزوں نے ان کی فکشن فہم کو وسیع کیا۔

فضیل جعفری :

ڈاکٹر نارنگ کی بصیرت کا بہترین اظہار فکشن کی تنقید میں ہوا ہے لیکن اس کا ذکر آگے آئے گا، جہاں تک شاعری کا تعلق ہے میرے لئے یہ کہنا ممکن نہیں کہ ڈاکٹر نارنگ نے اپنے تمام تر مطالعے ذہنی شغف اور دلچسپی کے باوجود شاعری کے ساتھ

انصاف کیا ہے، یعنی شاعری کے بارے میں انہیں جتنا لکھنا چاہیے تھا یا جتنا وہ لکھ سکتے تھے اس کا عشرعشیر بھی نہیں لکھا۔ میر انیسؔ اور اقبالؔ کے متعلق ان کی اسلوبیاتی تنقید کا ذکر کر چکا ہوں، ان کے دوسرے مضامین میں ''غالبؔ کا جذبۂ حب الوطنی اور سنہ ستاون''، ''شعر جوہرؔ اور جذبہ شوقِ شہادت''، ''شعر حسرتؔ کی سیاسی جہت'' اور ''شاعر حریت و فطرت جوشؔ ملیح آبادی''، صرف قابل ذکر ہی نہیں بلکہ ایسے مضامین ہیں جنہیں نارنگ کی وسیع تر ذہنی اور تنقیدی دلچسپی کے ثبوت کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ ان مضامین میں ان کا تنقیدی ذہن، صوتیاتی اور اسلوبیاتی جکڑ بندیوں سے تقریباً آزاد ہو کر سماجی، سیاسی اور اخلاقی صورت حال سے پیدا ہونے والے ان انسانی احساسات و جذبات کو پیش کرتا ہے جو شعر کی شکل میں ہمارے سامنے آتے رہے ہیں۔ ان مسائل کے تعلق سے نارنگ نے خاص لگن اور دقت نظر کا ثبوت دیا ہے۔

قیصر تمکین، لندن :

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اردو کے وہ واحد نقد نگار ہیں جنہوں نے مغربی تنقیدی نظریات کا بالاستیعاب مطالعہ کیا ہے، انہوں نے جدید نظریات سے اردو کے ادبی حلقوں کو روشناس ہی نہیں کرایا ہے بلکہ ان کی توضیح کرتے ہوئے انہیں مشرقی فکریات کے تناظر میں پرکھا ہے۔ ڈاکٹر نارنگ نے جدید ترین نظریاتی بنیادوں اور میلانات سے بحث کرتے ہوئے اور ساختیاتی اندازِ فکر اور ادبی تنقید کے باہمی رشتے کی وضاحت کی ہے، اس سلسلے میں انہوں نے مغرب سے مرعوب ہوئے بغیر اپنی الگ شناخت متعین کرائی اور نئے نئے فکری دبستانوں اور نقد ادب کے فلسفیانہ تقاضوں کو پوری طرح اپنی گرفت میں لے کر انہوں نے ایک منفرد بلکہ اجتہادی قدم یہ اٹھایا ہے کہ سنسکرت اور عربی و فارسی شعریات کی تفہیم بھی کی ہے۔

شبنم عشائی، کشمیر :

حقیقت یہ ہے کہ نارنگ صاحب کی نظریاتی اور عملی تنقید نے نہ صرف اردو

ادب بلکہ The History of Literature کے وہ سربستہ راز منکشف کئے ہیں جن کی وجہ سے اردو ادب کو ایک نئی توانائی حاصل ہوئی ہے، جمود کے وہ صحرا جنہوں نے جدیدیت کے طوفانوں میں تخلیقی ادب کو گھیر لیا تھا اب شکست کھا چکے ہیں، تخلیق کار کو مناظر اور روایتوں سے بھرپور اب تخلیقی معاشرہ میسر آ گیا ہے جس میں نئی تخلیقات جنم لے رہی ہیں، نئے اسالیب کو زندگی مل رہی ہے اور ادب کا کارواں رواں دواں اب ایک بحر زخار میں بدل گیا ہے، نئے ناموں کے ساتھ تخلیقیت کا ایک نیا جشن بپا ہے، تفہیم کی نئی دنیائیں سامنے آ رہی ہیں اور ادب کو فلسفہ ادب کو نئے آسمان اور نئی زمینیں مہیّا ہیں، وہ بار بار کہتے ہیں کہ جس نئی فکر یا مابعد جدید فضا کی میں بات کرتا ہوں وہ کسی نظریے کی غلام نہیں ہے۔ مابعد جدید دور تخلیق کے جشن جاریہ کا دور ہے۔

محمد متین ندوی :

اردو زبان و ادب کے نباض، محقق و نقاد بالخصوص فکشن کے بے مثل نقاد پروفیسر گوپی چند نارنگ صاحب کا ایک بڑا کارنامہ ہندوستانی ذہن و تہذیب کے ساتھ اردو شاعری کے رشتہ و تعلق کو واضح کرنا بھی ہے۔ اس رشتہ کو انہوں نے کسی ایک مضمون یا چند مضامین کے ذریعہ نہیں واضح کیا بلکہ اس سلسلہ میں انہوں نے تین ضخیم کتابیں تصنیف کی ہیں جو قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی سے بڑے سلیقہ کے ساتھ شائع ہوئی ہیں۔ مذکورہ کتابوں کے نام یہ ہیں۔ ''ہندوستانی قصوں سے ماخوذ اردو مثنویاں''، ''اردو غزل اور ہندوستانی ذہن و تہذیب''، ''ہندوستان کی تحریک آزادی اور اردو شاعری''۔ مذکورہ کتابوں کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اردو شاعری کا ہندوستانی ذہن و تہذیب سے کتنا گہرا تعلق ہے، یہ ایک روشن حقیقت ہے کہ اردو شاعری کی کسی بھی صنف کا مطالعہ کیا جائے تو اس پر ہندوستانی تہذیب و ثقافت کی چھاپ بہت گہری نظر آتی ہے۔ اس حقیقت کو جس قدر تفصیل سے گوپی چند نارنگ صاحب نے پیش کیا ہے یہ انہیں کا حصہ ہے۔

☆☆☆☆

''اردو زبان اور لسانیات''

گوپی چند نارنگ کا نیا علمی کارنامہ

یہ بات طے شدہ ہے کہ جب تک پروفیسر گوپی چند نارنگ جیسی ہستیاں دنیا میں پیدا ہوتی رہیں گی اردو زبان کو کوئی خطرہ لاحق نہیں ہوسکتا۔ حال ہی میں شائع ہونے والی نارنگ صاحب کی عالمانہ کتاب ''اردو زبان اور لسانیات'' اس کی زندہ مثال ہے جس میں نارنگ صاحب نے اردو زبان کے متعلق ۲۵ ایسے مضامین شائع کئے ہیں جن کے ایک ایک لفظ ایک ایک سطر سے ان کے اردو سے والہانہ عشق کا اظہار نمایاں ہے۔ پروفیسر نارنگ کی یہ کتاب اردو زبان اور لسانیات پر ہی نہیں ہے بلکہ اردو کے ایک سچے عاشق کے عالمانہ تجربات، ان کے دل سے نکلے ہوئے کلمات کے ذریعہ اس بات کا ثبوت فراہم کرتی ہے کہ پروفیسر گوپی چند نارنگ نے اردو سے سچا عشق ہی نہیں کیا بلکہ اپنی زندگی اردو کے لیے وقف کردی ہے۔ اور جو کچھ انہوں نے اردو سے پایا اس کا بھی انہوں نے کھل کر اعتراف کیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

> ''میں اکثر کہا کرتا ہوں کہ میرا سفرِ اردو سفرِ عشق ہے، اثبات خودی کی نہیں، تسلیم خودی کی راہ ہے جس میں لین نہیں دین ہی دین ہے اور میں نے تو دیا کچھ بھی نہیں، میری بساط ہی کیا اور لے لیا کتنا، یہ کسر نفسی نہیں کہ میری پہچان جو تھی، ہے اور جیسی بھی ہے اردو کی بدولت ہے، یہ اردو کی فیاضی نہیں تو کیا ہے کہ میں تو کچھ بھی نہ دے سکا اور اس نے مجھے اتنا کچھ دیا کہ کسی کو بھی کسی نے کیا دیا ہوگا۔''

اس اقتباس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ نارنگ صاحب نے کس آسانی سے کہہ دیا کہ میں نے اردو کو کچھ نہیں دیا اور اردو نے مجھے مالا مال کر دیا جبکہ سچائی یہ ہے کہ نارنگ صاحب نے اردو کو اتنا کچھ دیا ہے کہ اردو زبان مالا مال ہوگئی ،ان کے افکار و خیالات سے ان کی تحریروں سے ان کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ سے آج جبکہ لوگ پندرہ بیس سال غیر معیاری شعر کہہ کر اور اپنے شعری مجموعوں کے انبار لگا کر اردو زبان کی خدمت کا ڈھنڈورا پیٹنے لگتے ہیں، نارنگ صاحب نے تمام عمر اردو کے لئے قربانیاں دینے کے بعد بھی یہ کہا کہ میں نے اردو کو کچھ نہیں دیا بلکہ اردو نے مجھے بہت کچھ دیا۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ ان کا ہر لمحہ اردو ادب کی خدمت کے لئے وقف ہے اور زیر نظر کتاب یعنی ''اردو زبان اور لسانیات'' میں تو انہوں نے اپنا کلیجہ نکال کر رکھ دیا ہے۔ یہ کتاب تو ان کی زندگی کا ایک ایسا کارنامہ ہے جس پر اہل اردو کو ناز ہے، دوسرے یہ کہ جب جب اردو پر مصیبت کے دن آئے ہیں، پروفیسر گوپی چند نارنگ سینہ سپر ہو کر کھڑے ہو گئے ہیں،لوگ زبانی دعوے کرتے ہیں، نارنگ صاحب نے عملی طور پر کام کیا ہے۔ اس کتاب کی اشاعت ایسے ماحول میں ہوئی ہے جب ایک بار پھر اردو سازشوں کے گھیرے میں ہے۔ ڈاکٹر گیان چند جین صاحب جیسے اردو کے جاں نثار بھی پینترا بدل کر کھڑے ہو گئے ،لیکن نارنگ صاحب نے یہ کتاب شائع کر کے ایک بار پھر اردو پر حملہ کرنے والوں کو شکست فاش دے دی اور انہیں ہمیشہ کے لئے خاموش کر دیا۔ ایسے ماحول میں اس کتاب کی اشاعت نے اردو والوں کو مایوسی سے بچا لیا۔ اس کتاب کے بارے میں پروفیسر خلیل احمد بیگ لکھتے ہیں:

> ''اردو زبان اور لسانیات'' پروفیسر گوپی چند نارنگ کے ان گراں قدر لسانیاتی مضامین کا مجموعہ ہے جو اردو زبان کے حوالے سے وقتاً فوقتاً لکھے گئے ہیں۔ یہ مضامین گزشتہ پچیس تیس سال کے دوران اردو کے مقتدر رسائل میں شائع ہوکر داد و تحسین حاصل کر چکے

ہیں۔ یہ ہندوستان کے سماجی، تہذیبی، تاریخی اور لسانی تناظر میں
اردو زبان کی صحیح اور سچی تصویر پیش کرتے ہیں اور جدید لسانیاتی
مباحث کا باقاعدہ طور پر آغاز کرتے ہیں۔ ان یادگار مضامین کی
اشاعت سے اردو کے لسانیاتی ادب میں نہ صرف وقیع اضافہ ہوا
ہے بلکہ اردو زبان کو علمی وقار حاصل ہوا ہے۔ یہ مضامین نارنگ
صاحب کی لسانیاتی فکر و بصیرت کو سمجھنے اور ہندوستان جیسے کثیر لسانی
ملک میں اردو کو درپیش مسائل سے متعلق ایک صاحب نظر ادیب
کے موقف کو جاننے میں ہماری مدد کرتے ہیں۔ اردو زبان اور اس
کے رسم خط سے نارنگ صاحب کو فطری اور والہانہ لگاؤ ہے اور اردو
کے لسانیاتی مسائل کی وضاحت سے انہیں جو گہری دلچسپی ہے اس
کی واضح تصویر ان مضامین میں دیکھنے کو ملتی ہے۔

اس وقت ہم یہ بحث نہیں کر رہے ہیں کہ پروفیسر گوپی چند نارنگ نے کیا کچھ لکھا، کتنا لکھا یا ان کی شخصیت اور کارناموں پر کتنا کچھ لکھا گیا بلکہ بات ہے ان کی تازہ علمی کتاب ''اردو زبان اور لسانیات'' کی۔ گیان چند جین کی کتاب آتے ہی چاروں طرف سے ان پر گھیرا بندی شروع ہوگئی اور کچھ لوگ، اخبارات و رسائل صرف اس وجہ سے کہ گیان چند جین کی کتاب امرت رائے اور گوپی چند نارنگ صاحب سے منسوب کی گئی ہے، بہت سے شکوک میں مبتلا ہوگئے اور نارنگ صاحب کو بھی شک کے دائرے میں گھیر لیا کہ وہ اس بات کی وضاحت کریں کہ اس کتاب کی اشاعت میں ان کا کتنا ہاتھ ہے۔ کچھ اخبارات اور رسائل نے باقاعدہ نام لے کر ان سے اس بات کی وضاحت چاہی لیکن نارنگ صاحب نے بجائے ہر کس و ناکس کا جواب دینے کے چند ہی مہینوں میں خاموشی کا طلسم توڑتے ہوئے اچانک ہی ایک دھماکہ خیز عالمانہ کتاب اردو زبان اور لسانیات ادبی دنیا میں پیش کردی اور صاف طور پر لکھدیا کہ اردو میری جان ہے، اردو میرا

وجود ہے، اردو سے میں ہوں ورنہ میرا وجود کچھ نہیں۔ یہ عالمانہ کتاب ان سارے شکوک وشبہات کی دھند کو صاف کرتے ہوئے ایک اردو کے سچے جاں نثار کا ایک ایسا ثبوت فراہم کرتی ہے کہ وہ اردو کی خدمت کا دعویٰ کرنے والے بھی شرمسار ہو گئے جنھوں نے کیا تو کچھ بھی نہیں لیکن اپنی تحریروں اور تقریروں سے بلا وجہ اپنے الزامات سے سچے اردو کے پرستاروں کو ذہنی تکلیف پہنچانے کا کام کرتے رہے۔

اردو زبان اور لسانیات کی اشاعت نے ایسے ماحول میں اردو کی وہ خدمت انجام دی ہے جس کی مثال ادبی دنیا میں نہیں مل سکتی، اس لئے کہ اعتراضات کرنے والے تو سینکڑوں ہیں زبانی ہنگامہ برپا کرنے والے بھی سینکڑوں مل جائیں گے لیکن کسی نے ایسا عملی کام انجام دینے کی جرأت نہیں کی نہ کسی اور اردو ادیب کو یہ نصیب ہوا کہ وہ اردو کی بقا کے لئے اردو کے ماحول کو سازگار بنانے کے لئے یا اردو پر بُرا وقت آنے پر کوئی عملی قدم اٹھائے۔ نارنگ صاحب ایک دانشور بھی ہیں، ماہر لسانیات اور ایک عظیم نقاد ہی نہیں بلکہ اردو کے ایک سچے جاں نثار بھی ہیں، اردو کے سچے عاشق بھی ہیں اور یہ کتاب ان کے سچے اردو کے پرستار ہونے کا ثبوت ہے، یہ ادبی کارنامہ انھوں نے ایسے وقت میں انجام دیا ہے جب اس کی سخت ضرورت تھی اور زبان اور لسانیات کے دیباچے میں ہی نارنگ صاحب نے سب کچھ بیان کر دیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

> ''یہ بات بتانے یا جتانے کی نہیں کہ اردو سے میری وابستگی دیوانگی کی حد تک ہے۔ جب لوگ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ اردو کی خدمت کر رہے ہیں تو مجھے حیرت ہوتی ہے کہ اتنی بڑی زبان جس کے ذریعہ کروڑوں لوگ اپنی زندگی کو بامعنی بناتے یا اپنے وجود کی شناخت کراتے ہیں وہ کسی فرد واحد کی خدمت کی محتاج کیسے ہوسکتی ہے، سب جانتے ہیں کہ اردو بے چاری صدیوں کی تہذیبی کمائی ہے، یہ ملی جلی گنگا جمنی تہذیب کا وہ ہاتھ ہے جس کے بغیر نہ صرف

> ہم گونگے، بہرے بلکہ بے ادب بھی ہیں، میں نے بار بار کہا ہے
> کہ اردو کو محض ایک زبان کہنا اردو کے ساتھ بے انصافی ہے، یہ
> ایک طرز حیات، ایک اسلوب زیست، ایک انداز نظر یا جینے کا
> ایک سلیقہ وطریقہ بھی ہے، اس لئے کہ اردو صدیوں کے تاریخی ربط
> وارتباط سے بنی ایک جیتی جاگتی زندہ تہذیب کا ایسا روشن استعارہ
> ہے جس کی کوئی دوسری مثال کم از کم برصغیر کی زبانوں میں نہیں۔
> اردو کا ایک نام سیکولرزم یعنی غیر فرقہ واریت اور بقائے باہم بھی
> ہے، اردو نے صدیوں سے اس کی معنی خیز مثال قائم کی ہے اور ہر
> طرح کی تنگ نظری اور دقیانوسیت کے خلاف محاذ باندھا ہے، لمحہ
> فکریہ یہ ہے کہ کیا ایسے انسانیت پرور تصور کے بغیر ہمارے آزاد
> جمہوری معاشرے نہ صرف یہ کہ اپنے ترقی پذیر ہونے کا جواز
> فراہم کر سکتے ہیں بلکہ کیا کسی کشادہ اور روادار تہذیبی تصور کے بغیر
> وہ زندہ بھی رہ سکتے ہیں۔''

گوپی چند نارنگ صاحب نے اپنی اس تازہ علمی کتاب اردو زبان اور لسانیات کے دیباچہ میں اردو زبان کی اہمیت، اس کی افادیت اور اردو کے بغیر زندہ رہنے کے تصور پر جس طریقے سے روشنی ڈالی ہے وہ کوئی ادنیٰ یا خالی اردو کے حق میں دعویٰ کرنے والا نہیں لکھ سکتا، ایسی تحریر صرف وہ ہی شخص لکھ سکتا ہے جس کے ذہن و دل میں ہی نہیں بلکہ جس کی زندگی میں صرف اردو ہو اور نارنگ صاحب ایک ایسی ہی شخصیت کا نام ہے، اردو کے بغیر زندہ رہنے کے تصور ہی سے کانپ اٹھتے ہیں۔ اس قدر کھل کر اردو زبان کی اہمیت اور افادیت کا اعتراف کرنا اور ایک ایسی کتاب لکھنا جس کے لفظ لفظ سے اردو کی اہمیت ٹپکتی ہو اردو سے سچا عشق کرنے والا ہی تحریر کر سکتا ہے۔ اس کتاب کا پہلا مضمون ''اردو ہماری اردو'' ہے، جس میں نارنگ صاحب نے اردو کے رسم خط سے متعلق اظہار

خیال کیا ہے کہ بغیر رسم خط کے اردو اردو ہی نہیں رہے گی اردو رسم الخط کی اس قدر حمایت بھی سچا عاشق اردو ہی کرسکتا ہے ورنہ آج کیا ہمیشہ سے اردو والوں میں اردو رسم خط کے ہی دشمن رہے ہیں۔ عصمت چغتائی، راہی معصوم رضا اس کی مثال ہیں، اس کتاب کے سلسلے میں یعنی کتاب کے پیش لفظ میں مرزا خلیل احمد لکھتے ہیں:

''زیرنظر کتاب پانچ حصوں پر مشتمل ہے جن میں کل ملا کر پچیس مضامین شامل ہیں، پہلے حصے میں سات مضامین ہیں جو اردو کے تاریخی تناظر کے ساتھ ساتھ اس کے حالیہ مسائل کا جائزہ بھی پیش کرتے ہیں، نیز اردو ہندی کے لسانی رشتوں پر بھی روشنی ڈالتے ہیں۔ ان کے مطالعے سے برصغیر میں اردو کی تاریخی، تہذیبی اور لسانی اہمیت کا تو اندازہ ہوتا ہی ہے اردو سے متعلق نارنگ صاحب کے موقف کا بھی پتہ چلتا ہے، نارنگ صاحب ماہر لسانیات ہونے کے علاوہ اردو کے شیدائی بھی ہیں، اردو زبان اور رسم خط سے انہیں سچا پیار ہے تاہم وہ اردو کے بارے میں حقیقت پسندانہ طرز استدلال سے کام لیتے ہیں۔ اپنے پہلے مضمون ''اردو ہماری اردو'' میں وہ بجا طور پر اردو کو پچھلی کئی صدیوں کی تہذیبی کمائی سے تعبیر کرتے ہیں اور اسے مختلف فرقوں اور طبقوں کے درمیان محبت یگانگت کی علامت تصور کرتے ہیں۔ اردو زبان کو وسیع تناظر میں رکھ کر دیکھتے ہیں جس کا رشتہ ہمارے ملک کی ایک ہزار سالہ تاریخ سے استوار ہے جو ہماری مشترکہ تہذیب کی علامت ہے اور جو ہماری پہچان بھی ہے۔''

اس اقتباس کو پڑھ کر اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ نارنگ صاحب کی کتاب صرف اردو زبان پر ہی نہیں ہے بلکہ اس میں ہندوستان کی ایک ہزار سالہ تاریخی وتہذیبی

تناظر کی جھلکیاں بھی صاف طور سے دیکھی جا سکتی ہیں۔ جہاں ایک طرف کتاب کے پہلے مضمون ''اردو ہماری اردو'' میں رسم خط اور اس کی اہمیت پر روشنی ڈالی گئی ہے تو دوسرے مضمون ''اردو کی ہندوستانی بنیاد'' میں پورا تاریخی، سیاسی، سماجی پس منظر پیش کردیا، اس طرح تیسرے مضمون میں جو کہ اردو کے محاوروں اور کہاوتوں کی سماجی توجیہہ پر ہے، چوتھا مضمون اردو کے افعالِ مرکبہ پر ایک نظر کے عنوان سے ہے، ان تینوں چاروں مضامین میں نارنگ صاحب نے اردو سے متعلق کیا کچھ نہیں لکھا، اردو کی اہمیت، افادیت کے علاوہ ہندوستانی تہذیب اور اردو سے متعلق تمام مسائل کا جائزہ اس خوبصورتی سے لیا ہے کہ اردو ایک طاقتور زبان کے روپ میں صاف ستھری دکھائی دینے لگی اور جو لوگ اردو سے مایوسی کی بات کرتے ہیں انہیں بھی آئینہ دکھا دیا کہ وہ زبان کبھی ختم نہیں ہوسکتی جس کی جڑیں ہندوستانی تہذیب کی ایک ہزار سالہ تاریخ میں پیوست ہیں، اردو کے لئے زبانی دعوے کرنے والے تو ہزاروں ہیں لیکن عملی کام کرنے والوں کا دور دور تک پتہ نہیں لیکن نارنگ صاحب نے اردو کے لئے عملی کام کرکے دکھایا ہے، وہ اردو بولتے ہیں، اردو پڑھتے ہیں، اردو لکھتے ہیں، اردو کے بارے میں سوچتے ہیں، اردو کے لئے سفر کرتے ہیں، اردو کے لئے تقریریں کرتے ہیں، ایسے عمل کام کرنے والے اگر دو چار ہی پیدا ہوجائیں تو اردو کہاں سے کہاں پہنچ جائے۔ نارنگ صاحب کے دل میں اردو کے لئے جو تڑپ ہے وہ یوں تو ان کی ساری کتابوں اور بے شمار مضامین میں ان کی زندگی ان کے کارناموں میں دیکھی جاسکتی ہے لیکن جس تڑپ کا اظہار انھوں نے اپنی اس تازہ علمی کتاب اردو زبان اور لسانیات میں گویا اپنی پوری زندگی کے درد کو سمیٹ کر رکھ دیا ہے، صرف کتاب کے دیباچے ہی میں سب کچھ بیان کردیا ہے، دیگر مضامین میں جو کہ اردو سے متعلق ہیں ان میں اردو اور ہندی کا لسانی اشتراک، قصہ اردو زبان کا، اردو رسم الخط، ایک تاریخی بحث، اردو رسم الخط تہذیبی ولسانی مطالعہ، اردو املا اور لسانیات، روایت اور اجتہاد کی روشنی میں بھر پور جائزہ لیا ہے۔ پروفیسر نارنگ نے یہ کتاب ایسے

موقع پر پیش کی ہے جب اردو پر چاروں طرف سے یورش کی جارہی ہے، بجائے اس کے وہ تقریر یا زبانی بیانات دیتے انھوں نے اردو کی حمایت میں ٦٦٠ صفحات کی یہ کتاب پیش کردی اور یہ ثابت کردیا کہ کام کرنے والے اس طرح کرتے ہیں اور باتیں کرنے والے صرف باتیں، اور ظاہر ہے کہ صرف زبانی باتوں سے اردو کا کوئی بھلا نہیں ہوسکتا، اس کے لئے عمل کی ضرورت ہوتی ہے اور عملی کام یہ ہے جو نارنگ صاحب نے اردو زبان اور لسانیات پر کیا ہے۔ ایک سچے اردو کے پرستار نے ایک ایسا کام اور ایسے موقع پر کر دکھایا جب اس کی ضرورت حد سے زیادہ تھی، جب اردو اور اردو والوں پر مایوسی کے سایے ہر طرف سے گھیرا ڈالے ہوئے تھے، یوں تو انہوں نے تمام زندگی اردو کے لئے وقف کر رکھی ہے اور ان کا اوڑھنا بچھونا ہی اردو ہے لیکن یہ کتاب صحیح وقت پر لا کر انھوں نے ایک ایسا کارنامہ انجام دیا ہے کہ اردو زبان و ادب پر ہی نہیں اردو والوں پر بھی ایک احسان عظیم ہے، یہ کتاب ہمیشہ اردو والوں کو احساس کمتری کے دائرے سے باہر نکال کر امید کے چراغ روشن کرتی رہے گی اور اس کی کرنیں چاروں طرف بکھرتی رہیں گی۔ ادبی دنیا میں اردو زبان سے متعلق ایسی تاریخی دستاویزی کتاب کی اشاعت پر تمام اہلِ اردو کی جانب سے ہم نارنگ صاحب کو مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

☆☆☆☆

پروفیسر گوپی چند نارنگ کی تازہ علمی کتاب ''اردو زبان اور لسانیات'' پر ایک مباحثہ

مرتب: سیفی سرونجی

پروفیسر گوپی چند نارنگ کی تازہ علمی کتاب ''اردو زبان اور لسانیات'' پر ایک مباحثہ سیفی لائبریری سرونج میں ۲۷ راگست ۲۰۰۶ء کو منعقد ہوا، شرکائے مباحثہ تھے: نسیم انصاری، محمد ایوب واقف، کوثر صدیقی، اقبال مسعود، سیفی سرونجی، پروفیسر مختار شمیم، محمد توفیق خاں، محمد متین ندوی، انل اگروال۔

نسیم انصاری: میری نارنگ صاحب سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی تھی، حال ہی میں ساہتیہ اکاڈمی کی چار روزہ تقریبات کے سلسلے میں وہ بھوپال آئے، یہ تقریبات بھارت بھون میں منعقد ہوئیں، کوثر صدیقی نے موصوف کو منشی حسین خاں ٹیکنیکل سینٹر میں مدعو کیا، پہلی بار انھیں دیکھا اور سُنا۔ میں پروگرام کی نظامت کر رہا تھا، نارنگ صاحب نے مجھے ایک فہرست بھیجی جس میں تمام مہمانان، مدعوئین کے اسمائے گرامی لکھے تھے، وہ اپنے پروگرام میں بلائے گئے تمام لوگوں کے بے حد Concerned نظر آئے۔ نارنگ صاحب بین الاقوامی شہرت کے مالک ہیں، ان کے مقام کا تعین تو مستقبل کا مورخ کرے گا لیکن ایک بات تو طے ہے کہ وہ اردو کے لئے زندہ ہیں، اردو ان کا اوڑھنا بچھونا ہے، اردو ان کا عشق ہے، اردو ان کا مذہب ہے، جب انھوں نے تقریر کی تو اپنی حالیہ کتاب ''اردو زبان اور لسانیات'' کے دیباچے سے دو پیراگراف پڑھ کر

سنائے۔ انھیں سن کر اور سمجھ کر بہت سے لوگوں کے ذہن صاف ہو گئے، ''ایک بھاشا، دو لکھاوٹ، دو ادب'' کے انتساب نے جو غلط فہمی پیدا کی تھی وہ یکسر دور ہو گئی۔ وہ انتہائی صاف ذہن انسان ہیں، اردو والے بیشک ان کی ذات پر فخر کر سکتے ہیں بلکہ میں یہ کہوں گا کہ کسی کتاب کو ان کے نام معنون کر کے انھیں یا ان کے نام کو Exploit نہیں کیا جا سکتا۔ کتاب مذکور کے دیباچے میں ''بین السطور'' میں بہت کچھ ہے۔ ''تاڑنے والے قیامت کی نظر رکھتے ہیں'' نارنگ صاحب بلا مبالغہ اردو کے عظیم سپاہی، غیر متعصب اور عظیم شخصیت ہیں۔

بھوپال کی ہر دل عزیز شخصیت نظم کے مشہور شاعر نسیم انصاری صاحب نے گوپی چند نارنگ صاحب سے حالیہ ملاقات اور ان کی ایک گھنٹہ کے تقریر جو کہ اردو زبان [illegible] سے متعلق تھی، کا حوالہ [illegible] نگ صاحب کی تازہ علمی کتاب ''اردو زبان اور لسانیات'' پر بہت تفصیل سے روشنی ڈالتے ہوئے نارنگ صاحب کی شخصیت، ان کی اردو سے دیوانگی کی حد تک محبت پر کھل کر اظہار خیال کیا، اِس کے بعد مدھیہ پردیش اردو اکاڈمی کے سکریٹری، ممتاز ادیب، صحافی اقبال مسعود صاحب نے نارنگ صاحب کی کتاب ''اردو زبان اور لسانیات'' پر اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کیا:

اقبال مسعود: اردو کی تمام ہستیوں، برصغیر ہندو پاک میں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کا نام نامی ایک روشن مینار کی طرح ہے جو اردو کے ناسمجھ اور کم عقل دوستوں کی اس طرح رہنمائی فرماتے ہیں جیسے اندھیرے اور سیاہ دنوں میں گہرے سمندر میں بھٹکتے جہازوں کو روشنی راہ دکھاتی ہے۔ ان کی تازہ کتاب ''اردو زبان اور لسانیات'' اردو ہندی کے درمیان کج بج مباحثہ، مذہبی بنیادوں پر تقسیم کرنے والے، افراد اور جذباتی ہم وطنوں کو غور کرنے، سوچنے، فکر کرنے اور لائحہ عمل مرتب کرنے کی راہ دکھاتی ہے۔

اردو ادب میں گزشتہ پچاس برسوں کے دوران جب جب خاموشی اور
جمود کا زمانہ آیا ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے فکری سطح پر کوئی نہ کوئی ادبی
بحث اور تحریک کا آغاز کر کے اس جمود، خاموشی اور منجمد احساس میں
جولانی فکر اور عمل کی شمع روشن کی۔ ان کی آراء سے اختلاف ممکن ہے مگر
یہ بات طے ہے کہ وہ ادبی سطح پر محرک کرنے، فکر سازی کرنے اور
جمالیاتی ذوق کی حنا بندی کا کام کرتے ہیں، ان کی تازہ کتاب ''اردو
زبان اور لسانیات'' بہت سے افراد کے ذہنی جالے صاف کرنے اور غور
وفکر کرنے، بحث ومباحثہ اور نئی راہ متعین کرنے میں کامیاب ہوگی۔

اقبال مسعود صاحب کے بعد مشہور شاعر، ادیب و ایڈیٹر 'کاروانِ ادب' کوثر
صدیقی یوں فرماتے ہیں:

کوثر صدیقی: ڈاکٹر گوپی چند نارنگ صاحب دورِ حاضر کی ایسی عہد ساز شخصیت کا نام
ہے جو صدیوں میں آتی ہے، آپ نے اردو کو جس طرح اپنا اوڑھنا بچھونا
بنایا ہے، وہ کسی اور کے بس کی بات نہیں، آپ گزشتہ پچاس سال سے
اردو کے محاذ پر اردو کی حفظ و بقا کے لئے مردِ مجاہد کی طرح نبرد آزما ہیں،
آزادیٔ وطن کے بعد جب جب اردو زبان و ادب پر حملے ہوئے ہیں
آپ نے حملہ آوروں کو ترکی بہ ترکی جواب دیا ہے، خواہ وہ اردو رسم الخط
کا معاملہ ہو یا کوئی اور معاملہ۔

حال ہی میں ڈاکٹر گیان چند جین صاحب کی تازہ کتاب ''ایک بھاشا دو
لکھاوٹ دو ادب'' پر بھوپال میں آپ نے ایک ملاقات میں فرمایا کہ
اردو ایک مکمل زبان ہے اور دستور ہند نے ایک زبان کے طور پر اس
کے موجودہ رسم الخط میں تسلیم کیا ہے تو رسم الخط کی بحث بے معنی ہو جاتی
ہے اور اگر کوئی اسے بدلنے یا کسی قسم کی ترمیم کی بات کرتا ہے تو شاید وہ

جانے انجانے میں دستور ہند کو تسلیم نہیں کرتا۔ آپ نے ڈاکٹر گیان چند صاحب کی مذکورہ کتاب کا اگر چہ براہِ راست جواب نہیں دیا ہے لیکن ان کی تازہ مطبوعہ کتاب ''اردو زبان ولسانیات'' میں آپ کے جو پچیس مضامین ہیں ان میں آپ نے مدلل طور پر ان سب کا جواب دے دیا ہے۔ مذکورہ کتاب کا دیباچہ پوری کتاب کی روح ہے۔ نارنگ صاحب اردو کے لئے جتنی عقیدت محبت رکھتے ہیں اس سے زیادہ موثر انداز میں اس کا اظہار ممکن نہیں ہے۔ جین صاحب نے اپنی مذکورہ کتاب نارنگ صاحب کے نام منسوب کی ہے، اس سے قاری کو یہ غلط فہمی پیدا ہوتی ہے کہ شاید نارنگ صاحب جین صاحب کے خیالات سے متفق ہیں، نارنگ صاحب نے بھی جہاں تک میرا علم ہے ابھی تک اس انتساب پر تحریری یا تقریری طور پر کوئی تبصرہ یا خیال ظاہر نہیں کیا ہے، اس لئے عوامی ذہن میں شک وشبہات پیدا ہوتے ہیں۔ نارنگ صاحب نے اپنی مذکورہ کتاب کے دیباچے میں لکھا ہے:

''مجھے کبھی محسوس نہیں ہوا کہ اردو میرے خون میں جاری وساری نہیں، میں آج تک یہ نہیں سمجھ سکا کہ اردو میری ہڈیوں کے گودے تک کیسے اترتی چلی گئی، یقیناً کچھ تو جادو ہوگا۔''

۲۶راگست ۲۰۰۶ءکو بھوپال میں منعقدہ ایک جلسے میں آپ نے جس انداز میں اردو کا دفاع کیا اور کہا کہ اردو صرف ایک زبان ہی نہیں اس سے زیادہ ہے، وہ ایک تہذیب کی ترجمان ہے، ایک طرز معاشرت ہے۔

اردو کے خلاف گیان چند جین صاحب کی کتاب سے جو غلط فہمی پیدا ہوگئی ہے یا ہورہی ہے، اس کا ازالہ اس کتاب سے ہو جاتا ہے۔ آپ نے

فرمایا کہ نفرت کا جواب نفرت سے نہیں، محبت سے دیا جاتا ہے، گیان چند جین صاحب کی کتاب پر برہمی ہونا فطری عمل ہے لیکن اس کا جواب نارنگ صاحب نے اپنی مذکورہ کتاب سے بلاواسطہ جس طرح عالمانہ انداز میں دیا ہے وہ لائق صد آفریں ہے، ضرورت اس بات کی ہے کہ نارنگ صاحب جس مشن کو لے کر اردو کے محاذ پر کام کر رہے ہیں اس میں ہر محبّ اردو کو شریک ہونا ضروری ہے۔

کوثر صدیقی صاحب کے بعد سرونج کے بزرگ ادیب توفیق خاں نے کہا کہ:

محمد توفیق خاں: ''میں نے اپنی بیاسی سالہ زندگی میں پروفیسر گوپی چند نارنگ جیسا اردو کا سچا عاشق نہیں دیکھا، گوپی چند نارنگ نے ہمیشہ سینہ سپر ہو کر اردو دشمنوں کا مقابلہ کیا ہے اور جب جب اردو کے لئے قربانیوں کی ضرورت پڑی ہے وہ ہمیشہ پیش پیش رہے ہیں۔ ان کی تازہ علمی کتاب ''اردو زبان اور لسانیات'' بھی ایسی ہی کتاب ہے۔ جو لوگ اردو رسم الخط اور اردو زبان کے مستقبل سے مایوسی کی بات کرتے ہیں وہ یہ کتاب پڑھ کر یقیناً حیران ہوں گے اور اس بات کا اعتراف کریں گے کہ گوپی چند نارنگ کے سامنے یا ان کی زندگی میں کوئی اردو مخالف اپنے پورے سیاسی جوڑ توڑ یا دباؤ میں آ کر کچھ بھی لکھنے کی جرأت کرنے سے پہلے ہزار بار یہ سوچنے پر مجبور ہوگا کہ ابھی پروفیسر گوپی چند نارنگ جیسے اردو کے سچے عاشق زندہ ہیں، یہ کتاب اردو زبان اور لسانیات لکھنے والا کوئی معمولی محقق نہیں ہوسکتا، جب تک کہ اردو کے لئے اس کے دل میں تڑپ نہ ہو۔

محمد ایوب واقف: گوپی چند نارنگ اردو زبان و ادب کے سچے سفیر ہیں، گوپی چند نارنگ صاحب نے گزشتہ پچاس سال سے قلم و قرطاس سے اپنا رشتہ جوڑے رکھا ہے، اس پوری مدت میں کوئی ایک بھی ایسا موقع نہیں آیا جب

انھوں نے ایک سفیر کے درجے اور رتبے سے روگردانی کی ہو، وہ اردو زبان، اس کی گنگا جمنی تہذیب اور اس کے رسم الخط کے عاشق ہیں، ادھر جب سے اردو کے مشہور محقق گیان چند جین کی متنازعہ کتاب ''ایک بھاشا دو لکھاوٹ دو ادب'' چھپ کر سامنے آئی ہے ان کی شخصیت شک کے گھیرے میں آگئی ہے، شک کے گھیرے میں آنے کی وجہ یہ ہے کہ گیان چند جین نے اپنی اس کتاب کو ان کے نام منسوب کیا ہے، لیکن خوش قسمتی سے اب گوپی چند نارنگ صاحب کی کتاب ''اردو زبان اور لسانیات'' شائع ہوکر سامنے آگئی ہے۔ اس کتاب میں کم از کم گیارہ ایسے مضامین ہیں جو اردو زبان اور اس کے رسم الخط کی پُرزور حمایت کرتے ہیں، لیکن اس کتاب کے آغاز میں ان کا جو مختصر دیباچہ ہے اسے پڑھ کر میرے اس خیال کی پوری تائید ہوجاتی ہے کہ وہ اردو زبان و ادب کے سچے سفیر ہیں۔ اب ہم گوپی چند نارنگ صاحب سے یہ کہنے کی ضرورت نہیں محسوس کریں گے کہ وہ اس بات کی وضاحت کریں کہ آیا وہ گیان چند جین کے بیانات سے اتفاق کرتے ہیں یا اس کی تردید کرتے ہیں۔

پروفیسر مختار شمیم: گوپی چند نارنگ صالح ذہنیت کے مالک ہیں اور انھوں نے ہمیشہ اردو زبان کی ترقی کے بارے میں صالح فکر کا اظہار کیا ہے، وہ عاشق اردو ہیں اس لئے اردو کو وہ تمام تر تہذیبی روایات کے ساتھ زندہ اور پائندہ دیکھنا چاہتے ہیں، اردو کیونکہ ہندوستانی زبان ہے اور ہندوستان ہی میں پلی بڑھی ہے اور اس کی شناخت ہندوستان ہی میں ممکن ہے، یہ صحیح ہے کہ پاکستان کا اردو ادب پروان چڑھا لیکن وہاں اردو زبان کا کوئی مستقبل نہیں ہے۔ ہندوستان میں ہی اردو زبان و ادب کی ترویج و ترقی

ممکن ہے اور جب تک گوپی چند نارنگ جیسے اردو زبان کے شیدا اور عاشق پیدا ہوتے رہیں گے یہ زبان اپنی شیرینی کے ساتھ اپنا جلوہ بکھیرتی رہے گی۔

گوپی چند نارنگ کی تازہ علمی کتاب ''اردو زبان اور لسانیات'' ایک قابل قدر کارنامہ ہے اور گیان چند جین کے حالات کے تناظر میں نارنگ صاحب کی یہ کتاب اردو کو تمام الزامات سے بری کرتی ہے۔ ہم گوپی چند نارنگ صاحب کو مبارکباد پیش کرتے ہیں کہ جب اردو کے لئے ایسی فضا تیار ہوئی کہ شکوک شبہات کے بادل چھانے لگے تو نارنگ صاحب کی تحریر نے پوری فضا کو روشنی سے بھر دیا اور اپنی فکر و نظر کے ایسے اُجالے بکھیرے کہ اردو زبان کا مستقبل توانا نظر آنے لگا۔

پروفیسر مختار شمیم کے بعد سیفی سرونجی نے گوپی چند نارنگ کی تازہ علمی کتاب ''اردو زبان اور لسانیات'' پر اس طرح اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

سیفی سرونجی: یوں تو پروفیسر گوپی چند نارنگ نے پوری زندگی اردو زبان و ادب کی خدمت میں ہی صرف کی ہے لیکن ان کی تازہ علمی کتاب ''اردو زبان اور لسانیات'' تو ان کی پوری زندگی کے کارناموں کا ایک جیتا جاگتا ثبوت ہے، اس عالمانہ کتاب کو پڑھنے کے بعد یہ بات میں پورے یقین اور اعتقاد کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ جب تک پروفیسر گوپی چند نارنگ جیسی اردو کی دلدادہ ہستیاں پیدا ہوتی رہیں گی اردو زبان کو کوئی خطرہ لاحق نہیں ہوسکتا۔ ۲۶/اگست ۲۰۰۶ء کو بھوپال میں کاروانِ ادب کے جلسے میں نارنگ صاحب نے ایک گھنٹہ کی تقریر اور تازہ علمی کتاب ''اردو زبان اور لسانیات'' کا دیباچہ پڑھ کر سنایا تو اہل بھوپال اور تمام اردو والے نہ صرف حیران رہ گئے بلکہ پروفیسر گوپی چند نارنگ کے اردو سے

والہانہ عشق کے قائل ہو گئے کہ ان جیسا اردو کا چاہنے والا صدیوں میں پیدا ہوتا ہے۔ دیباچے کی چند لائنیں پڑھ کر ایک لرزہ طاری ہو جاتا ہے۔ آپ سوچئے جب نارنگ صاحب نے یہ پڑھا تو کیا عالم ہوا ہوگا۔

''یہ بتانے یا جتانے کی ضرورت نہیں کہ اردو سے میری وابستگی دیوانگی کی حد تک ہے، جب لوگ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ اردو کی خدمت کر رہے ہیں تو مجھے حیرت ہوتی ہے کہ اتنی بڑی زبان جس کے ذریعہ کروڑوں لوگ اپنی زندگی کو با معنی بناتے یا اپنے وجود کی شناخت کراتے ہیں وہ کسی فرد واحد کی خدمت کی محتاج کیسے ہو سکتی ہے۔''

بلا شبہ نارنگ صاحب نے اردو سے عشق کیا ہے اور دیوانگی کی حد تک کیا ہے، ان پر ہر لمحہ اردو کا نشہ طاری رہتا ہے اور اس ہر لمحے کو انھوں نے اس عالمانہ کتاب 'اردو زبان اور لسانیات' میں مقید کر دیا ہے۔

سیفی سرونجی کے بعد نوجوان ادیب محمد متین ندوی نے کہا:

محمد متین ندوی: پروفیسر گوپی چند نارنگ صاحب اردو زبان کے محقق، نقاد، دانشور، مفکر اور ماہر لسانیات کی حیثیت سے عالمی سطح پر شہرت رکھتے ہیں۔ ان کو دیکھنے اور سننے کی کافی عرصے سے آرزو تھی جو ابھی حال ہی میں ۲۳ر اگست ۲۰۰۶ء سے ۲۶ر اگست ۲۰۰۶ء تک بھارت بھون بھوپال میں ساہتیہ اکاڈمی کے تحت منعقد ہونے والے پروگرام میں شرکت کی وجہ سے پوری ہوئی۔ ابھی حال ہی میں پروفیسر گوپی چند نارنگ صاحب کی معرکتہ الآرا تصنیف اردو زبان اور لسانیات جو رضا لائبریری، رام پور کے اہتمام سے شائع ہوئی ہے، اسے پڑھ کر بے انتہا مسرت اور علم میں اضافہ ہوا، ساتھ ہی عالمی شہرت یافتہ محقق پروفیسر گیان چند جین صاحب کی یاد بھی آئی کہ انھوں نے بھی کچھ دنوں قبل ایک کتاب لکھی ہے جس کا

نام ''ایک بھاشا دو لکھاوٹ دو ادب'' رکھا ہے، اس میں انھوں نے کیا لکھا ہے یہ کسی بھی پڑھنے لکھنے والے سے پوشیدہ نہیں۔ اہل قلم کی طرف سے جین صاحب کی اس کتاب پر سخت ردِعمل کا مظاہرہ کیا گیا۔ ہر کس و ناکس نے تنقیدی تیروں کی بارش کر دی، ان پر لکھتے وقت حریفانہ انداز اختیار کیا گیا، اگرچہ اپنائیت کا انداز اپناتے ہوئے بھی بات کہی جا سکتی تھی لیکن ایسے حالات میں عام طور پر جذبات حاوی ہو جاتے ہیں اور صبر کا دامن ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے، جہاں تک جین صاحب کی محققانہ حیثیت کا تعلق ہے تو وہ بلا شبہ تحقیق کے میدان کے شہسوار ہیں اور ساتھ ہی قابل احترام بھی، اگر چہ مذکورہ کتاب میں انھوں نے خود ہی اپنے بتائے ہوئے تحقیقی اصولوں سے انحراف کیا ہے، ایسا لگتا ہے کہ جین صاحب کو یہ کتاب لکھنے پر مجبور کیا گیا ہے، کیونکہ کتاب میں موجود باتیں ان کی شخصیت سے میل نہیں کھاتیں۔ جین صاحب کی کتاب پر بڑی تعداد میں اہل قلم نے اپنے ردِعمل کا اظہار کیا ہے لیکن نارنگ صاحب کی طرف سے کسی قسم کے ردِعمل کا اظہار نہیں ہوا۔ اردو زبان اور لسانیات کے دیباچے کو پڑھ کر ایسا لگتا ہے کہ جو کچھ پروفیسر نارنگ صاحب کو کہنا تھا وہ سب مثبت انداز میں دیباچے میں ہی کہہ دیا ہے، صرف دیباچے کو ہی پڑھنے سے بہت سارے سوالات کے جوابات مل جاتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ کتاب جین صاحب کی کتاب کے جواب میں منظر عام پر آئی ہے جس میں علمی، تاریخی، تجزیاتی، نظریاتی، لسانیاتی تحریریں اور نارنگ صاحب کا پچاس سالہ لسانی سفر موجود ہے۔

اس مباحثے کے آخر میں سد بھاؤنا منچ کے صدر انل اگروال نے کہا کہ میں اردو کا آدمی نہیں ہوں لیکن گوپی چند نارنگ صاحب کی تقریروں اور ان کے کارناموں کو

دیکھ کر اردو کی طرف مائل ہوا ہوں، دوسرے لفظوں میں یوں کہنا چاہیے کہ ان کی شخصیت اور تقریر نے مجھے اردو سیکھنے اور پڑھنے پر مجبور کردیا۔ میرے اسی جذبے کو دیکھتے ہوئے انھوں نے مجھے کئی بڑے سیمیناروں میں بلایا، یہی میرے لئے سب سے بڑا اعزاز ہے، اس کتاب سے متعلق بھی ان سے کھل کر گفتگو ہوئی، سچائی تو یہ ہے کہ نارنگ صاحب اردو کے شیدا ہیں اور میں ان کا شیدا ہوں

ورلڈ پیس فاؤنڈیشن کے صدر ڈاکٹر فخر الزماں لاہور میں
پروفیسر گوپی چند نارنگ، صدر ساہتیہ اکادمی کا استقبال کرتے ہوئے

پروفیسر گوپی چند نارنگ کا نیا علمی کارنامہ

رضا لائبریری رامپور فخر سے یہ اعلان کرتی ہے کہ اردو کے سربرآوردہ ادیب اور مرکزی ساہتیہ اکادمی کے صدر پروفیسر گوپی چند نارنگ کی تازہ علمی کتاب

"اردو زبان اور لسانیات"

رضا لائبریری کے زیر اہتمام شائع ہوگئی ہے جو پچیس انتہائی اہم علمی و تحقیقی مضامین پر مشتمل ہے، یہ مضامین ہندوستان کی صدیوں کی ملی جلی تہذیب اور ثقافت کی آئینہ دار اردو زبان کے تاریخی ارتقاء اور پس منظر کو بڑی علمی اور تکنیکی مہارت سے پیش کرتی ہے

سیفیؔ سرونجی کی کتابیں

۱- روشن الاؤ شعری مجموعہ Rs.100/-
۲- ایک لمحہ ایک خواب ، Rs.100/-
۳- ناؤ سمندر موجیں ، Rs.150/-
۴- ہم رہ گئے اکیلے، کہانیاں
۵- ہم بھی ایڈیٹر بن گئے، انشایئے
۶- سیفی سرونجی، ایک مطالعہ مرتب انیس دہلوی
۷- سرونج سے لندن تک سفرنامہ Rs.100/-
۸- جنگل کانٹے دھوپ، دیوناگری Rs.100/-
۹- رنگ اور خوشبو، دیوناگری Rs.50/-
۱۰- رنگوں کا امتزاج، مضامین Rs.100/-
۱۱- گنبد خضرا-نعتیہ کلام Rs.50/-
۱۲- سیفی سرونجی شخصیت اور فن
مرتبہ محمد توفیق محمد خاں Rs.500
۱۳- گاؤں کا مسافر
۱۴- انور شیخ اور انکے کارنامے Rs.100/-
۱۵- عاصی کاشمیری اور انکی شاعری Rs.100/-
۱۶- انور شیخ ایک مقبول شاعر Rs.100/-
۱۷- گلشن کھنہ، شخصیت اور فن Rs.100/-
۱۸- سیفی سرونجی - ایک تنقیدی نظر Rs.150/-
۱۹- گوپی چند نارنگ اور اردو تنقید Rs.150/-

غیر مطبوعہ

ساحر شیوی کے ادبی کارنامے
خالد محمود مشاہیر کی نظر میں
نئی غزل نئے امکانات
اردو کی نئی بستیاں
صلاح الدین پرویز بحیثیت نظم نگار

سہ ماہی انتساب کے خصوصی نمبر

بشیر بدر نمبر	Rs.500/-
خالد محمود نمبر	Rs.500/-
ظفر گورکھپوری نمبر	Rs.250/-
ابراہیم اشک نمبر	Rs.100/-
ندا فاضلی نمبر	Rs.200/-
وقار فاطمی نمبر	Rs.100/-
محمد ایوب واقف نمبر	Rs.200/-
محمد ممتاز راشد نمبر	Rs.50/-
قاضی مشتاق احمد نمبر	Rs.200/-
انور شیخ نمبر	Rs.200/-

رابطہ: سہ ماہی 'انتساب'، سیفی لائبریری، سرونج (ایم. پی.) 484 224
فون: 07591-253819

GOPI CHAND NARANG AUR URDU TANQEED

BY

Dr. Saifi Sironji

انل اگروال، سیفی سرونجی اور پروفیسر گوپی چند نارنگ

سیفی سرونجی انل اگروال اور پروفیسر گوپی چند نارنگ